جلد (۱۰) عدد (۴)
ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۶ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ ۸/
قیمت سالانہ (صمہ)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت صفحات قیمت بلا جلد (للعہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ﷲ انگریزی ﷲ سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ جلد ۱ عدد ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین، جس کو ہم نے اشاعت گذشتہ میں بیان کیا تھا، کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اِس نصب العین سے کسی "مسلم" فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے اس امر میں ہے کہ ہمارے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اب ہمیں اُن مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیئے جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہ راست خود واضح ہو جائیگی۔

ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے "ہندوستانی" ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت "مسلمان" ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریک حال ہیں۔ ملک افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہوگا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہونگے۔ ملک کو لوٹا جائے گا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور وظلم کی حکومت ہوگی تو ہم بھی اُسیطرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہل وطن ہوں گے۔ ملک پر غلامی کی رو سے بحیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل ہوں گی، جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصہ ملیگا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی اور معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوام ہند کے درمیان مشترک ہیں۔ جس طرح ان کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو، اس کے وسائل ثروت

اسی کے باشندوں کی بہتری اور ترقی پر صرف ہوں، اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس، اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی، اور اپنی تمدنی پسماندگی کا علاج کرنے میں اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم ان کو اپنی ناجائز اغراض کے لیے آلہ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن کا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلا نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصول حیات کو، ہمارے نظام جماعت کو زبردست نقصان پہونچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی اُن تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے اور روز روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورت حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائیگی، اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بنائے جا رہے ہیں، ہمارے دل و دماغ کی تہوں میں وہ جڑیں سوکھتی چلی جا رہی ہیں جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ حشیش پلایا جا رہا ہے جو ہماری ماہیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں تغیرات ہو رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آ لگی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سواد اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائے گا، اور شاذ گنتی کے چند نفوس، اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کے لیے باقی رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقا و تحفظ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں، اور اُس نظام اجتماعی کو از سر نو قائم کریں جس کے مٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر یہ مصائب نازل ہوئے ہیں۔

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے، نہ عملاً۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگانِ ہند کے درمیان مشترک ہیں اُن کو حل کرنے کے لیے مشترک طور پر ہی جدوجہد کرنی چاہیے، اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں، وہ بھی بہرطور ہمیں اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے، اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے، اور درحقیقت اسی مقام پر بہت سوں نے دھوکا کھایا ہے۔

غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ آکر ٹھیرے ہیں ایک دوراہا موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمت پر جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جانا کدھر چاہیے۔

آزادیٔ وطن کا ایک راستہ وہ ہے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بنانے والے اور اس پر ہندوستان کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر وطنی قومیت کا مغربی تصور ہے، اور اس تصور کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصور گہرا جما ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اُس "قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصولِ حیات کی رعایت تو درکنار، اس کے لیے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جس کی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل رہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں ان کو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں (Organised religion)

یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک اصولاً قابلِ اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو اور اس کو تعلیم معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھکر کچھ مدت تک اس قسم کے "منظم مذہب" کو ایک محدود اور دھندلی سی شکل میں باقی رکھنا گوارا کرلیں گے چنانچہ اسی گوارا کرلینے کے انداز میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو ان کی زبان اور پرسنل لا کے تحفظ کا یقین دلایا ہے، مگر وہ کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کرسکتے جو اس "منظم مذہب" کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستانِ جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہوکر طبعی موت مرجائے؛ اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بن جائے جس میں سیاسی پارٹیوں، اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں؛ اور وہ رنگ فطرۃً وہی ہونا چاہیے جو اس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جس کی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اُسی وقت اختیار کرسکتے ہیں جب کہ ہم اپنی دوسری حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہوجائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہوسکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے، بلکہ اس راستہ میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہوجاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اس کی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردعمل کا کوئی امکان نہ رہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہوجائیں، بہرحال انگریزی قومیت

میں جذب نہیں ہو سکتے۔ بہر حال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جس کا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے لیکن یہاں تو صورت حال ہی دوسری ہے۔ ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان، حتی کہ ہمارے احساس قومیت تک کو طائفیت (Communalism) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پروپگنڈا کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مستقل جماعت (Community) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابل برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو (Nationalists) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پوجا عادت تک میں حصہ لے گذرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انھیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر (Communalism) کا الزام نہ آجائے جو ان کے نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بدتر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بن کر نہ آؤ بلکہ افراد بن کر آؤ اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زردارے اور بے زر کے تنازع میں منقسم ہو جاؤ۔ بالفاظ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے، اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم و غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اسے سمجھنے کے لیے کچھ بہت زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریک آزادی وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے، اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے آپ اپنی نشاۃ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں اس آزادی کے منافع اس قدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کر سکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور چل جائیں۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریک آزادی وطن میں جان بوجھ

حصہ لینا گوارا کریگا۔

آزادی وطن کے لیے دوسرا راستہ صرف وہی ہوسکتا ہے جس میں کسی باشندۂ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونے کی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو، جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو، جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیاز مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے، مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کرسکے، اور ہر قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کرنا تو ہمارے لیے قطعاً ناگزیر ہے، لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لیے لڑسکتے ہیں اور لڑنا فرض جانتے ہیں، وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو 'وطن پرستوں' کے پیش نظر ہے، تو اس کی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ مبغوض سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے علم بردار مسلمانوں کے لیے وہی کچھ ہیں جو کلائو اور ولزلی تھے، اور ان کے پیرو مسلمان کسی حیثیت سے بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں ہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں مگر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جس کو ہم اپنا مقصود بتا رہے ہیں کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟ مسلمانوں میں آجکل دو گروہ نمایاں ہیں جو دو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادی وطن کے لیے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انھیں منظور کرلے تو اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انہوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی اُن بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں گذشتہ اشاعتوں میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اس قدر طاقتور ہیں کہ جدید نیشلزم سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سن لیجیے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا در اصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ محض جذبات سے اپیل کرکے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہیے۔ پہلے اس کی نبض دیکھیے اور اس کے مرض کا علاج کیجیے۔ پھر اس کی کمر سے تلوار بھی باندھ لیجیے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اُٹھ بہادر! اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدان کارزار میں!

یہ دونوں راستے جن لوگوں نے اختیار کیے ہیں ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لیے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوص ایمان میں ہم کو ذرّہ برابر شک نہیں مگر ان کی جلالت شان کا پورا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔

انہیں قدم اٹھانے سے پہلے حسب ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے:۔

(۱) مسلمانوں کی حیات قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" (Imperium-in-imperio) کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہوکر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

(۲) اٹھارویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہم کو اس چیز سے محروم کر دیا۔ اور اس کی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف جانے کے بعد انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار، اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں۔ اگر ہم نے اسی غفلت سے کام لیا جس سے گذشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اُسی سمت میں جائے گا جس میں پہلا انقلاب گیا تھا، اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دے گا جس کی طرف ہمیں اس کا پیش رو لے جا رہا تھا۔ اور اگر ہم غیر مسلم نظام حکومت کے اندر ایک مسلم نظام حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انقلاب اپنا رخ بدل دے گا اور ہمیں اپنے نظم اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق کے ذریعہ سے ممکن نہیں ہے کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کتنی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اس کے لیے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کو بحث مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جا سکتا ہے اور بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو

ایسی ایک غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقت ور رائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائدار نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابل تسخیر متحدہ ارادے سے اس کو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ (Accomplished fact) بن کر ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کا جز بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم سردست انقلاب کو اسی رفتار پر جانے دیں اور اس کی تکمیل ہونے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظام حکومت قائم ہو جائے اس وقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابل عمل خیال کر سکتا ہے جس کو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گذری ہو۔ ایک ہوشمند آدمی تو بادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رخ صرف دوران انقلاب ہی میں بدلا جا سکتا ہے، اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف اسی صورت میں بن سکتی ہے جب کہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لیے درکار ہے وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کانگریس ایک منظم جماعت ہے، اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرہ میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقتور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور اصول و مقاصد میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس وقت جن اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہیں ان کو لیے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا اُدھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگریسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے، وہ اکابر کانگریس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشاروں پر چلنے لگیں، اور اسلامی مقاصد کے لیے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

ہر شخص جس کو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہو، اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ "نیشنلسٹ" قسم کے مسلمان اگر کانگریس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کرلیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کے لیے کچھ مفید نہ ہوں گے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہوں گے اس لیے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کریں گے جو ایک غیر مسلم کرے گا، مگر ایسا کرنے کے لیے ان کو اُس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہوگی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے کہ بدقسمتی سے ان کے نام مسلمانوں کے سے ہوں گے۔

مذکورۂ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں، اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول بھی ممکن ہو۔ اس غرض کے لیے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہییں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے، اور ان کے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے، اور خصوصیت کے ساتھ اُن ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے جن پر ہمارے نظام جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر

مستعد ہو جائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (Social Conscience) احکام اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال کی طرف توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کے لیے تیار کرتی ہے۔

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیے کہ ہم اپنی جماعت کے اُن غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں جو اپنی فطری شرارت کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے، نہ ہندو کے غلاموں کو، بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر کھلے دل سے آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

(۶) مسلمانوں میں اس قدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تن واحد کی طرح ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے شائد بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکا رہے ہو۔ یہ قوم اس قدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اس کو سنبھالے تو سنبھالے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا ایک موقع، آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور وہی ہمارے لیے آخری شعاع امید ہے۔ قبل اس کے کہ وہ بجھے، ہم اس سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں، بشرطیکہ چند مردِ مومن ایسے اٹھ کھڑے

ہوں جو خلوص نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے لیے ہم کو بالآخر کانگریس ہی کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ لیکن سردست ہم اس سے صرف اس لیے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے ہم کو جس اخلاقی قوت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ ہم سب سے پہلے اپنی اِن کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے ہم کو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں، مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک، اس کے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنے کی کوشش کرے گی، اور براہ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور اشتراکیت کی تبلیغ شروع کردے گی اور اس غرض کے لیے ہماری قوم کے اُن منافقوں سے کام لے گی جن کی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں، تو اس صورت میں ہم کو مجبوراً اس سے لڑنا پڑے گا، اور اس لڑائی کا تمام تر الزام خود اُسی پر عائد ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدل خیال (Conversion) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ کو

یہ حق حاصل ہے تو ہم کو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں، شُدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ ۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس تصادم کے لیے تیار ہیں، اور اس کو ہندوستان کے مستقبل کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی سخت نادانی ہے۔

مقالات

توحید اور شرک

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ

توحید توحید کا اعتقاد، خیر وصلاح کی جڑ اور تمام اقسام خیرات کی اصل ہے۔ اس لیے کہ انسان میں رب العالمین کی خالص بندگی اسی سے پیدا ہوتی ہے، اور بندگی کا خلوص وہ چیز ہے جو کسب سعادت کا سب بڑا ذریعہ ہے، اور تکمیل انسانیت کی تدابیر میں سب سے زیادہ مفید تدبیر یعنی تدبیر علمی کی اصل ہے، اور اسی سے انسان کو غیب کی طرف توجہ تام حاصل ہوتی ہے اور اس کا نفس پاکیزہ ترین صورت سے عالم علوی کی طرف ترقی کرنے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت جتانے کے لیے فرمایا ہے کہ جو حیثیت انسان کے جسم میں قلب کی ہے کہ اس کے بگڑنے سے سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور اس کے سنورنے سے سارا جسم سنور جاتا ہے وہی حیثیت انواع خیرات میں توحید کی ہے کہ وہ جس قدر زیادہ خالص اور صحیح اور مضبوط ہوگی اسی قدر انسان صداقت اور نیکی کے راستہ پر مستقیم ہوگا۔ جو شخص اس حال میں دنیا سے رخصت ہو کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھیراتا تھا، اس کے حق میں سرکار رسالتمآب نے بر سبیل اطلاق فرمایا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوگا، اللہ نے اس پر آگ حرام کر دی، اسے جنت سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور نے حکایۃً بیان فرمایا ہے کہ جو شخص میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو وہ اگر گناہوں کا انبار لیے ہوئے بھی مجھ سے ملیگا تو میں اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملونگا۔

توحید کے چار مرتبے ہیں۔ ایک یہ کہ وجوب وجود کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص مانا جائے اور اس کے سوا کسی کو واجب الوجود نہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ ہی کو آسمانوں اور زمینوں اور تمام

جواہر کا خالق مانا جائے۔ یہ دو مرتبے تو ایسے ہیں جن پر آسمانی کتابوں میں بحث کرنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی، اس لیے کہ یہود و نصاریٰ تو درکنار مشرکین عرب کو بھی ان سے اختلاف نہ تھا۔ قرآن حکیم تصریح کرتا ہے کہ یہ مقدمات اُن کے نزدیک بھی مسلّم تھے، چنانچہ فرمایا۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶)

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور کہینگے کہ وہ اللہ ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶)

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے آسمان سے پانی آتارا اور اس کے ذریعہ سے زمین کو مرجانے کے بعد پھر زندگی بخشی تو وہ ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: ۷)

اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے تم کو پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تدبیر بھی صرف اللہ تعالیٰ سے متعلق سمجھی جائے اور چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق نہ ٹھیرایا جائے۔ یہ دونوں مرتبے باہم متلازم ہیں، اور ان کے درمیان ایسا طبعی رابطہ ہے کہ جو تیسرے مرتبہ کو مانیگا وہی چوتھے مرتبہ میں بھی ثابت اور مستقیم ہوگا۔ اختلاف جو کچھ ہوا ہے انہی مرتبوں میں ہوا ہے، اور اختلاف کرنے والے بیشمار فرقوں میں تین فرقے سب سے بڑے ہیں۔

کواکب پرست اس طرف گئے کہ تارے اور سیارے عبادت کے مستحق ہیں، اور دنیا میں ان کی عبادت نفع بخش ہے، اور حاجات کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تحقیق ہوگیا ہے کہ رات دن کے حوادث اور انسان کی سعادت و شقاوت اور صحت و سقم میں ان کا اثر بہت بڑا ہے، اور وہ مجرد ذی عقل نفوس رکھتے ہیں جو ان کو حرکت دے رہے ہیں، اور وہ اپنے عبادت گزاروں سے غفلت

نہیں کرتے۔ انہی اعتقادات کی بنا پر انہوں نے کواکب کے لیے ہیکل بنائے اور ان کی پرستش کی۔

مشرکین اس حد تک تو مسلمانوں سے متفق ہیں کہ بڑے بڑے امور کی تدبیر اللہ ہی کرتا ہے اور فیصلے اسی کے اختیار میں ہیں اور کسی غیر کے لیے اختیار کلی نہیں ہے، مگر ان کا گمان یہ ہے کہ ان سے پہلے جو صالحین گذرے ہیں انہوں نے اللہ کی بندگی و عبادت کر کے اس کے ہاں ایسا تقرب حاصل کر لیا کہ اللہ نے ان کو الوہیت عطا کر دی، اور وہ دوسرے بندگان خدا کی پرستش کے مستحق ہو گئے۔ گویا ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص شہنشاہ کی خدمت بڑی عمدگی سے بجا لائے یہاں تک کہ شہنشاہ اس کو خلعت پادشاہی عطا کر دے اور اپنی مملکت کے کسی حصہ کی تدبیر اس کے سپرد کرے۔ اب چونکہ وہ شہنشاہ کا مقرر کیا ہوا فرمانروا ہے اس لیے اس حصہ کے رہنے والوں پر اس کی بندگی واجب ہے۔ اسی تخیل کے تحت وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک کہ ان بزرگوں کی عبادت بھی اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ بلکہ بعض لوگ تو اس حد تک بڑھ گئے کہ حق تعالیٰ ہم سے اس قدر بلند و برتر ہے کہ کسی عبادت سے ہم اس تک تقرب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ جو اس سے تقرب حاصل کر چکے ہیں ان کی جناب میں رسائی پیدا کی جائے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ بزرگ سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، اپنے پرستاروں کی سفارشیں کرتے ہیں۔ ان کی حاجت روائی اور نصرت و اعانت کرتے ہیں، اور معاملات کی تدبیر انہی سے متعلق ہے۔ اسی خیال سے انہوں نے پتھروں کی مورتیں ان کے نام پر بنائیں اور ان بزرگوں کی ارواح کی طرف توجہ کرنے کے لیے ان مادی صورتوں کو وسیلہ بنایا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ان بتوں ہی کو اصل سمجھنے لگے اور خود انہی کو معبود اور حاجت روا قرار دے بیٹھے۔

نصاریٰ اس طرف گئے کہ مسیح علیہ السلام کو اللہ سے ایسا تقرب اور حق پر اتنا علو حاصل ہے کہ ان کو بندہ قرار دینا اور دوسرے بندوں کے برابر کر دینا درست نہیں اس لیے کہ یہ ان کے ساتھ بے ادبی اور ان کے تقرب من اللہ کا ابطال ہے۔ پھر اسی تخیل میں وہ آگے بڑھے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے

مسیح کی اس خصوصیت کو تعبیر کرنے کے لیے "ابن اللہ" کا لفظ پسند کیا، اس اعتبار سے کہ باپ اپنے بیٹے پر خاص نظر عنایت رکھتا ہے اور اپنی آنکھوں میں رکھ کر اس کی تربیت کرتا ہے اور اس کا مرتبہ غلاموں سے برتر ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے ان کے لیے "اللہ" کا نام زیادہ مناسب سمجھا کیوں کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ اُن کے اندر حلول کر گیا تھا اور اسی بنا پر ان سے وہ آثار ظاہر ہوتے تھے جو کبھی کسی بشر سے ظاہر نہیں ہوئے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا اور پرندوں کو پیدا کرنا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ مسیح کا کلام خدا کا کلام ہے اور انکی عبادت خدا ہی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے وجہ تسمیہ کو فراموش کر دیا اور "بیٹے" کے لفظ کو حقیقی معنوں میں لینے لگے یا یہ سمجھ بیٹھے کہ مسیح من جمیع الوجوہ واجب تعالیٰ ہیں۔

ان تینوں فرقوں کے پاس بہت لمبے چوڑے دعوے اور عجیب عجیب خرافات ہیں جو جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور چونکہ توحید کے انہی آخری دونوں مراتب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ تمام گمراہیاں پیدا ہوئیں اس لیے قرآن عظیم نے تمام تر انہی سے بحث کی ہے اور کافروں کے ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے

حقیقت شرک | سب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ عبادت سے مراد انتہا درجہ کا تذلّل ہے۔ اور کسی تذلّل کا دوسرے تذلّل کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہونا دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ بلحاظ صورت ظاہری ہوگا مثلاً ایک تذلّل بصورت قیام ہوا اور دوسرا بصورت سجود۔ یا پھر وہ نیت کے لحاظ سے ہوگا مثلاً یہ کہ ایک فعل میں اُس تعظیم کی نیت کی جائے جو بندے اپنے مولیٰ کی کرتے ہیں اور دوسرے فعل میں اس تعظیم کی نیت جو رعیت اپنے بادشاہ کی کرتی ہے اور تیسرے فعل میں وہ تعظیم مقصود ہو جو شاگرد اپنے استاد کی کرتے ہیں۔ ان دو شقوں کے سوا کوئی تیسری شق نہیں ہے۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو اور برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا، اور سجدہ، تعظیم کی صورتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کی صورت ہے تو لازم آیا کہ مدارج کا یہ امتیاز در اصل نیت ہی کی بنا پر ہو لیکن دراصل یہ معاملہ تنقیح کا طالب ہے، لہٰذا اب ہم اس کی تنقیح کرتے ہیں۔

تذلل کی حقیقت پر غور کرو۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو شخص کسی کے مقابلہ میں تذلل اختیار کرتا ہے وہ اپنے اندر ضعف اور اس کے اندر قوت دیکھتا ہے۔ اپنے میں خست اور اس میں شرف پاتا ہے۔ اپنے اندر انقیاد اور تخشع پیدا کرتا ہے اور اس کے اندر تسخیر و نفاذ حکم کی طاقت تسلیم کرتا ہے پس تذلل کی حقیقت ہی یہی ہے کہ وہ قوت کے مقابلہ میں ضعف اور شرف کے مقابلہ میں خست اور تسخیر و نفاذ حکم کے مقابلہ میں انقیاد و تخشع ہے۔ اب دیکھو کہ قوت اور شرف اور تسخیر اور ایسے ہی دوسرے کمالات کے متعلق انسان کے تصورات کیا ہیں۔ وہ اپنے اندر لامحالہ اس امر کا ادراک پاتا ہے کہ ان سب کمالات کے دو مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ تو وہ ہے جو انسان کے لائق ہے یا ان چیزوں کے لائق ہے جو انسان کی طرح اس عالم حدوث و امکان میں ہیں۔ اور دوسرا مرتبہ یا تو اس ہستی کے لائق ہے جو حدوث و امکان سے بالکلیہ بالاتر ہو، یا پھر اُس کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی طرف اس بالا و برتر ہستی کی کچھ خصوصیات منتقل ہو گئی ہوں۔ مثال کے طور پر غیب کے علم کو لے لو۔ انسان اس کے دو درجوں میں صاف طور پر امتیاز کرتا ہے۔ ایک درجہ کا علم غیب وہ ہے جو فکر و نظر اور ترتیب مقدمات سے یا حدس سے یا خواب کی حالت میں یا بہر حال کسی ذریعہ اور واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسرے درجہ کا علم علم ذاتی ہے، یعنی ایسا علم جو ذاتِ عالِم کا مقتضیٰ ہو، نہ یہ کہ وہ اسے کسی دوسرے سے حاصل کرے یا اس کے اکتساب کے لیے کوشش کرے۔ اسی طرح تاثیر اور تدبیر اور تسخیر غرض جو لفظ بھی اس معنی کے لیے تم بولو گے، اس کے بھی دو الگ الگ درجوں کا انسان کو ادراک ہوتا ہے۔ ایک درجہ وہ جو مباشرت کے معنی میں ہے، جوارح اور قوتوں کے استعمال سے اور کیفیات مزاجیہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی استعداد کسی نہ کسی طور پر انسان اپنے اندر پاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ وہ جو تکوین کے معنی میں ہے یعنی ایسی تدبیر و تاثیر جو کسی چیز سے مدد لیے بغیر کسی کیفیت جسمانیہ کے توسط کے بغیر محض موثر و مدبر کے ارادہ کے تحت حاصل ہو۔ اسی کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ

کُنْ فَیَکُوْنُ " یعنی اللہ کا کام اس طرح ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتا ہے" یہی حال شرف اور عظمت اور قوت کا ہے۔ انسان اس کے بھی دو مختلف درجوں میں لامحالہ تمیز کرتا ہے۔ ایک درجہ ایسی عظمت اور بزرگی کا ہے جیسی بادشاہ کو رعیت کے مقابلہ میں اور پہلوان کو کمزور کے مقابلہ میں اور استاد کو شاگرد کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے کہ ان سب کا مرجع اسباب و ذرائع کی طرف ہے، اور اصل شئے کے اعتبار سے ہر انسان اپنے آپ کو اس کے لائق پاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ وہ ہے جو بجز ایسی ہستی کے کسی میں نہیں پایا جاتا جو بہت ہی بالا و برتر ہو۔

غرض اس راز کی تفتیش میں تم آگے بڑھتے چلے جاؤ یہاں تک کہ تم کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص بھی سلسلۂ امکان کا ایک ایسی ہستی پر ختم ہونا تسلیم کرتا ہے جو غیر کی محتاج نہ ہو، وہ اضطراری طور پر ان تمام صفات کمالیہ و مدحیہ کو دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ درجہ جو اس ہستی کے لیے اور دوسرا وہ درجہ جو انسان اور اس کے مرتبہ کی ہستیوں کے لیے ہے۔ اب دیکھو کہ غلطی کہاں واقع ہوتی ہے۔ اول تو ان دونوں درجوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ باہم متقارب ہیں اس لیے آسمانی کتابوں کے نصوص کو اکثر غلط معنی پر محمول کرنے کا موقع نکل آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کبھی کسی انسان یا روح یا فرشتے سے کسی ایسے امر کے صدور پر انسان مطلع ہوتا ہے جس کو وہ اس جیسی ہستی سے مستبعد سمجھتا ہو تو وہ پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور جہالت کی بنا پر اس کی طرف خدائی بزرگی اور الٰہی تسخیر کو نسبت دینے لگتا ہے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ بالاتر درجہ کی معرفت میں سب لوگ یکساں نہیں ہیں۔ ایک شخص ان انوار کی قوت سے جو مواید پر محیط اور غالب ہیں حقائق پر چھا جاتا ہے اور انھیں ٹھیک ٹھیک پہچان لیتا ہے، مگر دوسرا شخص اتنی قوت نہیں رکھتا۔ تکلیف جو کچھ بھی ہے انسان کی استطاعت کے لحاظ سے ہے، لہٰذا جو شخص زیادہ بڑے درجہ کی معرفت پر قادر نہیں وہ اس کے لیے مکلف بھی نہیں۔ یہی تاویل ہے اس حکایت کی جو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ ایک بندۂ

خدا نے اللہ کے سامنے حاضر ہونے کے خوف سے اپنے گھر والوں کو وصیت کی تھی کہ جب وہ مرجائے تو اسے جلادیں اور اس کی راکھ کچھ پانی میں بہادیں اور کچھ ہوا میں اڑا دیں تاکہ وہ بعث بعد الموت سے بچ جائے۔ یہ شخص یقین رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ قدرت تامہ سے متصف تو ضرور ہے مگر قدرت ممکنات میں ہے نہ کہ ممتنعات میں اور اس کا گمان یہ تھا کہ جو راکھ پانی اور ہوا میں منتشر ہو چکی ہے اس کو جمع کرنا ممتنع ہے۔ اس کا یہ خیال اگرچہ حقیقت کے لحاظ سے غلط تھا، مگر اس کو کافر نہیں قرار دیا گیا، کیونکہ قصور دراصل اس کی فہم کا تھا، اور اس پر جو کچھ بھی محاسبہ ہونا تھا اس کی استعداد علمی ہی کے لحاظ سے ہونا تھا۔

انہی وجوہ سے اللہ تعالیٰ کو بندوں سے تشبیہ دینے، اور بندوں کو خدا کے درجہ میں لے جانے کی غلطی پیش آئی ہے۔ کہیں خدا کی طرف ایسے نقائص اور عیوب منسوب کیے گئے جو دراصل مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہیں۔ کہیں نجوم و کواکب کو ایسی صفات سے متصف ٹھیرایا گیا جو خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ اور کہیں بت اللہ کے صالح بندوں کو خدائی کا درجہ دیا گیا محض اس لیے کہ ان سے خوارقِ عادات انکشف اور استجابت دعا، کا ظہور ہوا تھا۔ ہر نبی جو کسی قوم میں مبعوث ہوا۔ اس کا کام یہی تھا کہ لوگوں کو شرک باللہ کی حقیقت سمجھائے، اور دونوں درجوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دے اور توحید کی اس طرح تعلیم دے کہ ذات مقدسہ واضح طور پر الگ ہو کر واجب تعالیٰ کی ذات میں محصور کر دیا جائے، اگرچہ الفاظ باہم متقارب ہی کیوں نہ رہیں، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طبیب سے فرمایا کہ تو محض رفیق ہے، اصل طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مگر جب وہ نبی گذر گیا اور اس کے اصحاب اور اس کے دین کے حامل بھی رخصت ہو گئے تو اس کے بعد ناکارہ نسلیں اٹھیں جنہوں نے اللہ کی عبادت کو چھوڑ دیا اور شہوات کی پیروی شروع کر دی۔ یہ لوگ ان متشابہ الفاظ کو جو نصوص میں استعمال ہوئے تھے ایسے معنی پر محمول کرنے لگے جو دراصل ان سے مراد نہ تھے، مثلاً انہوں نے اس محبوبیت اور شفاعت کو جسے اللہ تعالیٰ نے تمام شرائع میں اپنے خاص بندوں کے لیے ثابت کیا ہے غلط معنوں میں لے لیا۔ اسی طرح انہوں نے

خرق عادات اور اشراقات کے صدور کو اس امر پر محمول کیا کہ علم اور تسخیر کا وہ درجہ جو خدا کے لیے خاص ہے اُس شخص کی طرف منتقل ہو گیا ہے جس سے ان کا صدور ہوا ہے۔ حالانکہ درحقیقت ان سب چیزوں کا مرجع وہ ناسوتی یا روحانی قوتیں ہیں جو ایک طور سے تدبیر الٰہی کے نزول کا واسطہ بنتی ہیں۔ ایجاد اور خلق و تدبیر وغیرہ امور مختص باللہ میں ان کا ذرہ برابر کوئی دخل نہیں۔

اس مرض کے بیماروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں بعض تو وہ ہیں جو اللہ کے جلال کو بالکل ہی بھول چکے ہیں اور خداشناسی سے کچھ ایسے بیگانہ ہوئے ہیں کہ بس شرکاء ہی کی عبادت کرتے ہیں اور انہی کی طرف اپنی حاجتیں لے جاتے ہیں، اور اللہ کی طرف اصلاً کوئی توجہ نہیں کرتے، اگرچہ نظری حیثیت سے یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ سلسلۂ وجود کی انتہا اللہ ہی کی ذات پر ہوتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ سردار اکبر اور مدبر اعلیٰ تو اللہ ہی ہے مگر وہ اپنے کسی مقرب بندے کو شرف اور الوہیت کی خلعت سے سرفراز کر دیتا ہے، اور اسے بعض خاص امور میں تصرف کے اختیارات بخش دیتا ہے، اور اپنے بندوں کے حق میں اس کی سفارشیں سنتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صورت معاملہ قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک شہنشاہ اپنی سلطنت کے ایک ایک خطہ میں ایک ایک چھوٹا بادشاہ مقرر کرتا ہے اور بڑے بڑے معاملات کو اپنے لیے مخصوص کر کے باقی معاملات کی تدبیر ان چھوٹے بادشاہوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ لوگ جس بندۂ خدا کے متعلق اس طرح کے اعتقادات اپنے دل میں قائم کر لیتے ہیں اس کو خدا کا بندہ کہتے ہوئے ان کی زبانیں رکتی ہیں، کیوں کہ اُسے عام بندوں کے ساتھ مساوی کر دینے کو وہ اس کی اہانت سمجھتے ہیں۔ یہی خیال ہے جس کی بنا پر انہوں نے کسی کو ابن اللہ اور کسی کو محبوب الٰہی کے ناموں سے موسوم کیا اور اپنے آپ کو ان بندوں کا بندہ قرار دیا اور اپنے نام عبدالمسیح اور عبدالعزیٰ وغیرہ رکھے۔ یہی مرض ہے جس میں عام طور پر یہود و نصاریٰ اور مشرکین مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں آج کل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض منافقین مبتلا نظر آتے ہیں۔

چونکہ شریعت کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس چیز میں برائی کا گمان ہو اس کو اصل برائی کے مانند سمجھا جاتا ہے اور اصل برائی ہی کی طرح اس کی ممانعت کی جاتی ہے، اس لیے ہر اس عمل کو کفر قرار دیا گیا ہے جس کی محسوس صورت مشرکین کے عمل سے ملتی جلتی ہو اور جس میں شرک کا مظنّہ پایا جاتا ہو چاہے اس میں درحقیقت شرک کی نیت نہ ہو۔ مثال کے طور پر بتوں کے سامنے سجدہ کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا کفر ہے، اگرچہ ان افعال کا فاعل اپنے دل میں توحید کا قائل اور نیت کفر سے بالکل پاک ہی کیوں نہ ہو۔ اس علم کا دروازہ مجھ پر اس وقت کھلا جب مجھے بتایا گیا کہ بعض لوگ ایک قسم کی مکھی کو سجدہ کرتے ہیں جو زہریلی ہے اور اپنی دم اور پروں کو ہر وقت حرکت دیتی رہتی ہے۔ میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ فی الواقع کیا ان کے اندر شرک کی تاریکی موجود ہے، اور کیا گمراہی ان پر پوری طرح چھا گئی ہے؟ دل نے جواب دیا کہ میں تو ان میں یہ چیز نہیں پاتا کیونکہ یہ تو اس مکھی کو قبلہ بناتے ہیں اور تذلّل کے ایک درجہ کو دوسرے درجہ سے خلط ملط نہیں کرتے۔ اس کے بعد اصل راز کی طرف مجھے ہدایت بخشی گئی اور میرا دل اس علم سے بھر دیا گیا کہ شریعت نے اصل شرک کی طرح مظنّۂ شرک کو بھی حرام قرار دیا ہے، اور عبادت کی تمام ظاہری صورتوں کو بھی اصل عبادت کی طرح خدا کے لیے خاص کر دینے کا حکم دیا ہے، تاکہ لوگ صورت شرک سے حقیقت شرک تک پہنچ جانے کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں۔

اقسام شرک | شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی بزرگ شخص کے متعلق یہ اعتقاد رکھے کہ اُس سے جن آثارِ عجیبہ کا صدور ہوا ہے، وہ دراصل اس بنا پر اس سے صادر ہوئے ہیں کہ وہ اُن صفات کمالیہ میں سے کسی صفت سے متصف ہو گیا ہے جو انسان کے لیے سزاوار نہیں بلکہ حق جل مجدہ کے لیے مختص ہیں، اور ذات حق کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جا سکتیں الا یہ کہ خود حق تعالیٰ ہی اپنے سوا کسی اور کو خلعت الوہیت سے سرفراز کر دے، یا اس کو اپنی ذات میں فنا کر کے اپنی ذات سے باقی کر دے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے خرافات جن پر اس قسم کے اعتقادات رکھنے والے ایمان لاتے ہیں، سب کے سب شرک کی حقیقت میں

داخل ہیں مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ مشرکین اس طرح تلبیہ کرتے تھے کہ لبیك لبیك لاشریك لك الاشریکاً ھُولك تملکہ وماملك (لبیك لبیك، تیرا کوئی شریک نہیں بجز اس شریک کے جو تیرا ہے اور تو مالک ہے اس کا بھی اور ان چیزوں کا بھی جن کا وہ مالک ہے) اس طرح عرب کا مشرک خدا کے ساتھ ساتھ اپنے ٹھیرائے ہوئے شریک کے سامنے بھی انتہا درجہ کا تذلّل پیش کرتا تھا اور اُس کے ساتھ وہی معاملہ کرتا تھا جو بندے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں۔

شرک کی یہ روح بہت سے قالب اور طرح طرح کے پیکر اختیار کرتی ہے جن کا شمار نہیں ہوسکتا قرآن کی تعلیم کا اصل مقصد روح شرک کو مٹانا ہے تاکہ وہ کوئی قالب اور کوئی پیکر اختیار ہی نہ کرسکے لیکن شریعت (یعنی قانون اسلام) چونکہ تدبیر کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس لیے وہ خاص طور پر اس کے اُن قالبوں پر حملہ کرتی ہے جن کو عام طور پر لوگ شرک کی نیت سے اختیار کرتے رہے ہیں اور جن کا رابطہ رواج عام کی بدولت روح شرک کے ساتھ ایسا قوی ہوگیا ہے کہ نیت شرک کے بغیر بھی اگر ان کو اختیار کیا جائے تو ان میں مظنۂ شرک ضرور رہے۔ شریعت ایسی تمام عملی صورتوں کو حرام قرار دیتی ہے، کیونکہ یہ بات اس کے اصول میں سے ہے کہ وہ ہر چیز کی علت متلازمہ کو وہی حیثیت دیتی ہے جو خود اس چیز کی حیثیت ہو مصلحت کی علت متلازمہ خود مصلحت کے پہلو میں جگہ پائے گی، اور مفسدہ کی علتِ متلازمہ کو عین مفسدہ کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔

اب ہم تمہیں بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات میں کن کن امور کو مظنۂ شرک قرار دیکر ممنوع ٹھیرایا ہے۔

(۱) مشرکین بتوں اور کواکب کے آگے سجدہ کرتے تھے۔ اس لیے حکم ہوا کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرو چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ سجدہ کرو اُس خدا کو

لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (حٰمٓ السجدۃ: ۵) جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

چونکہ سجدہ میں شرک کرنا تدبیر میں شرک کرنے کے ساتھ متلازم ہے اور رہا ہے اس لیے موخرالذکر سے بچانے کی خاطر مقدم الذکر کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ توحید عبادت دراصل اللہ تعالیٰ کے اُن احکام میں سے ایک حکم ہے جو اختلاف ادیان و شرائع کے ساتھ ساتھ مختلف ہوتے رہے ہیں، اور جن کی بنا کسی دلیل برعانی پر نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تخلیق و تدبیر میں اپنی یکتائی و لاشریکی کو بطور دلیل پیش کر کے مشرکین کو شرک فی العبادۃ پر ملزم نہ ٹھیراتا، جیسا کہ سورۂ نمل کے پانچویں رکوع میں وہ ان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ "بتاؤ، اللہ بہتر ہے یا تمہارے وہ معبود جن کو تم اس کا شریک ٹھیراتے ہو؟ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسا کر خوشنما باغ لگا دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں نہریں جاری کیں اور اس کو ٹھیرانے کے لیے اُن پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان حد فاصل لگا دی؟ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی خدا ان کاموں میں شریک ہے؟"۔ یہ استدلال جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے دراصل الزامی استدلال ہے۔ چونکہ مشرکین خود معترف تھے کہ تخلیق اور امور عظام کی تدبیر میں اللہ کا کوئی شریک نہیں، اور یہ بھی ان کو تسلیم تھا کہ عبادت ان دونوں چیزوں کے ساتھ متلازم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود انہی کے مسلمات سے ان پر حجت قائم کی اور ثابت کر دیا کہ عبادت میں غیر کو شریک کرنا دراصل تدبیر و تخلیق میں غیر کو شریک سمجھنے کیساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا ایک کو روکنے کے لیے دوسرے کو روکنا ضروری ہے۔

(۲) مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے مدد مانگتے تھے[1]۔ کوئی بیمار ہوتا تو اُن سے دعا کرتے کہ

---

[1] استعانت بغیر اللہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے عجیب عجیب دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ

اسے اچھا کر دو۔ کوئی تنگ دست ہوتا تو ان سے التجا کرتا کہ مجھے مالدار بنا دو۔ کسی پر کوئی آفت آتی تو ان کو پکارتا کہ میری مدد کرو۔ وہ ان کے لیے نذر و نیاز کرتے اور توقع رکھتے تھے کہ ان نذروں اور نیازوں سے ان کے مقاصد حاصل ہوں گے۔ وہ ان کے نام جپتے اور امید رکھتے تھے کہ ان ناموں سے برکت حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو ممنوع کر دیا، اور حکم فرمایا کہ اپنی نمازوں میں بار بار اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کا اعادہ کرتے رہو۔ نیز فرمایا کہ لَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو) اس ارشاد میں دعا سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے، بلکہ دراصل استعانت مراد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ	اے نبی ان سے کہو کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ جائے یا قیامت آ موجود ہو تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے

تکملہ حاشیہ صفحہ ۲۵ جس طرح پیاس میں پانی سے استعانت کرنا اور مرض میں دوا سے استعانت کرنا شرک نہیں ہے اسی طرح اپنی حاجات اور اپنے مقاصد میں بزرگوں سے استعانت کرنا بھی شرک نہیں، لیکن یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری حاجات و ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے قانون فطرت کے تحت جو اسباب و وسائل پیدا کیے ہیں، ان سے کام لینا، اور ہر مقصد کے لیے ان اسباب کو استعمال کرنا جو سنت اللہ کے مطابق اس مقصد کے لیے مقرر کیے گئے ہیں یقیناً شرک نہیں بلکہ قانون الٰہی کا عین مقتضیٰ ہے مگر اس سلسلۂ اسباب و مسببات سے ہٹ کر اور قانون طبعی کو نظر انداز کر کے بزرگوں کی ارواح کی طرف رجوع کرنا اس امید کے ساتھ کہ وہ فوق الطبعی طریقے سے تمہاری حاجت پوری کریں گے' یا تدبیر الٰہی کے ڈھنگ پر سلسلۂ اسباب کو حرکت دیں گے یقیناً شرک ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس مضمون کی ابتدا میں تسخیر و تدبیر اور تاثیر کے جن دو درجوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان پر غور کرنے سے اس طریق استدلال کی غلطی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ارواح اولیاء کو پہلے درجے میں صاحب تسخیر و تدبیر سمجھتا ہے تو وہ مشرک تو نہیں مگر اندھا اور غیر ذی عقل ضرور ہے اس لیے کہ حضرات اس دنیا سے گذر چکے ہیں ان کا اس عالم مادی کے ساتھ تعلق باقی نہیں رہا ہے اور کوئی صاحب ہوش ان کو اس پہلے درجہ میں مدبر و موثر نہیں سمجھ سکتا۔ اور اگر کوئی شخص دوسرے درجہ یعنی درجۂ عالیہ و مقدسہ میں ان کو موثر و مدبر مانتا ہے تو اس کے مشرک ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ ترجمان القرآن

صَادِقِيْنَ - بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (الانعام: ۴)

اگر تم سچے ہو؟ نہیں بلکہ تم خدا ہی کو پکارو گے، پھر اللہ چاہے گا تو اس آفت کو دور کر دے گا جس کے لیے تم اسے پکارو گے اس وقت تم ان معبودوں کو بھول جاؤ گے جن کو شریک ٹھیراتے ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج: ۱۰)

خدا کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو، وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ سب کے سب مل کر ہی کیوں نہ کوشش کریں۔ اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ اس کو چھڑا بھی نہیں سکتے طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب بھی۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (الاعراف: ۲۴)

اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ خود اپنی بھی نہیں کر سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الاعراف: ۲۴)

خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو، وہ یقیناً تم ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو۔ اگر تم سچے ہو تو وہ تمہاری فریاد کو پہنچیں۔

۳۔ مشرکین اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا خواہ یہ تسمیہ حقیقی نہیں بلکہ مجازی معنوں ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس میں جو راز ہے اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

۴۔ وہ اپنے احبار (علما) اور رہبان (مشائخ) کو ارباب من دون اللہ بناتے تھے، اس معنی میں کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جو کچھ انہوں نے حلال ٹھیرا دیا ہے وہ نفس الامر میں حلال ہے اور اس کے ارتکاب میں کوئی خرابی نہیں، اور جو کچھ انہوں نے حرام ٹھیرا دیا ہے وہ درحقیقت حرام ہے اور اس کے ارتکاب پر

ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے سوال پر خود اس آیت کی تشریح فرمائی تھی کہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام مانتے تھے اور یہی ان کا شرک تھا۔ اس میں راز یہ ہے کہ تحلیل اور تحریم در اصل وہ تکوین ہے جو عالم ملکوت میں نافذ کی جاتی ہے کہ فلاں چیز پر مواخذہ کیا جائے گا اور فلاں چیز پر نہ کیا جائے گا، پھر یہی تکوین سبب بن جاتی ہے مواخذہ اور ترک مواخذہ کا۔ اور یہ مخصوص ہے اللہ تعالیٰ کے لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو تحلیل و تحریم منسوب کی جاتی ہے وہ تو اس معنی میں ہے کہ آپ کا حلال اور حرام قرار دینا اللہ کی تحلیل و تحریم پر قطعی الدلالت ہے۔ رہے امت محمدیہ کے مجتہدین تو ان کی تحلیل و تحریم اللہ کی تحلیل و تحریم پر قطعی الدلالت نہیں، بلکہ وہ صرف اس بنا پر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یا تو وہ معتبر ذریعہ سے نص شارع پیش کریں، یا نصوص معتبرہ سے استدلال کر کے کوئی حکم مستنبط کریں۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر مجرد کسی مجتہد کے قول کو حجت بنانا اور اس کی بنا پر کسی چیز کو حرام اور کسی چیز کو حلال مان لینا در اصل ان مجتہدین کو ارباب من دون اللہ بنانا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی رسول کو بھیجے اور اس کی رسالت ثابت ہو جائے اور اس کے ذریعہ سے اللہ کسی ایسی چیز کو حلال ٹھیرائے جو لوگوں کے نزدیک حرام ہو پھر کوئی شخص اس حکم کو قبول کرنے میں اپنے اندر رکاوٹ محسوس کرے اور اس کے نفس میں اپنے سابق طریقہ کی وجہ سے اُس حلال کی حرمت کا خیال باقی رہ جائے، تو اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ اس شریعت کے ثبوت ہی میں شک رکھتا ہو۔ اس صورت میں وہ کفر بالنبوت کا مرتکب ہو گا۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس چیز کو وہ کسی انسان کے کہنے پر حرام سمجھتا ہے۔ اس کے متعلق اس کا اعتقاد یہ ہو کہ اس کی تحریم منسوخ نہیں ہو سکتی بدیں وجہ کہ اللہ نے اپنے اس بندہ کو خلعت الوہیت سے سرفراز کر دیا تھا۔ اور وہ اللہ کی ذات میں فانی اور اس کی ذات سے باقی ہو گیا تھا، اور اس کا کسی چیز سے منع کرنا یا کراہیت کرنا در اصل اللہ کا فعل ہے، اور اس کی خلاف ورزی

کرنے میں جان و مال کے زیاں کا خطرہ ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ اعتقاد ہو تو وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے اور غیر اللہ کے لیے وہ چیز ثابت کرتا ہے جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

۵۔ مشرکین اپنے بتوں اور اپنے معبود ستاروں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے جانور ذبح کرتے تھے۔ اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو ذبح کرتے وقت ان کے نام لیے جاتے تھے، یا مخصوص قربان گاہوں پر قربانیاں کی جاتی تھیں[۱]۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو بھی حرام کر دیا۔

۶۔ مشرکین اپنے معبودوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے[۲]۔ اللہ نے اس کو بھی حرام کیا۔

۷۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بعض بزرگوں کے نام مبارک اور باعظمت ہیں، اور جو شخص ان کی جھوٹی قسم کھاتا ہے اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے ان کے نام کی قسم کھایا کرتے تھے اور اپنے جھگڑوں میں فریق مقابل سے ان کے نام پر حلف اٹھواتے تھے۔ اللہ نے اس کو بھی حرام ٹھیرایا اور اللہ کے نبی نے فرما دیا کہ جس نے خدا کے سوا کسی کی قسم کھائی اس نے خدا کے ساتھ شرک کیا۔ بعض محدثین نے اسکو تہدید و تغلیظ کے معنی پر محمول کیا ہے لیکن میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ کسی امر گذشتہ کی شہادت دینے کے لیے، یا آئندہ کوئی فعل کرنے یا نہ کرنے کا یقین دلانے کے لیے غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے، کیونکہ اس کی تہ میں یا تو درحقیقت وہ اعتقاد ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، یا اگر وہ اعتقاد نہیں ہے تب بھی اس کا مظنہ ضرور ہے[۳]۔

۸۔ غیر اللہ کے لیے حج کرنا بھی مشرکین کے طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا۔ حج لغیر اللہ سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص مقام کو کسی بزرگ ہستی کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ سے متبرک سمجھا جائے اور اس ہستی

---

[۱] بزرگوں کے نام سے کھانے کو منسوب کرنا، اور ان کے نام پر بکا بکا کر اسے متبرک سمجھنا، اور خاص خاص مقامات پر جا کر نیازیں اور نذریں چڑھانا بھی کسی طرح مشرکین کے اس فعل سے مختلف نہیں ہے۔

[۲] آج مسلمان بھی اس فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں، چنانچہ دکن میں بزرگوں کے نام پر بکرے چھوڑے جاتے ہیں۔

[۳] بزرگوں کے ناموں کی قسمیں کھانا بھی آج مسلمانوں میں عام ہے۔

تقرب حاصل کرنے کے لیے اس مقام کا قصد کیا جائے۔ اللہ کی شریعت میں اس کو بھی ممنوع کر دیا گیا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لاتشد الرحال الا الی ثلثۃ مساجد۔ یعنی تبرک اور تقرب حاصل کرنے کی نیت سے جو سفر کیا جاتا ہے تین مسجدوں کے سوا کسی اور مقام کی طرف نہ کیا جائے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ[1]۔

۹۔ مشرکین اپنے بچوں کو عبدالشمس اور عبدالعزیٰ اور ایسے ہی دوسرے ناموں سے موسوم کرتے تھے اور اہل کتاب بھی ان کی تقلید اختیار کر کے عبدالمسیح اور اسی قسم کے دوسرے نام رکھنے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو صرف خدا ہی کا بندہ نہ سمجھتے تھے بلکہ ستاروں اور بزرگوں کا بھی بندہ سمجھتے تھے۔ نیز ان کا طریقہ یہ بھی تھا کہ اولاد ہونے کے لیے اپنے معبودوں اور بزرگوں سے دعا کرتے یا ان کی منتیں مانتے تھے۔ اور جب بچہ پیدا ہوتا تو اس کا نام اسی ہستی کے نام پر رکھ دیتے تھے جس کی منت مانی تھی، گویا کہ یہ بچہ اسی کا بخشا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شرک اور حرام قرار دیا اور فرمایا کہ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الاعراف : ۷) یعنی جب اللہ ان کو چنگا بھلا بیٹا دیتا ہے تو وہ اس بخشش میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ اللہ ان کے اس شرک سے بہت بلند و برتر ہے"۔ اسی بنا پر بکثرت احادیث میں وارد ہوا ہے کہ سرکار رسالتمآب نے اس قسم کے ناموں کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے ناموں سے بدل دیا[2]۔

---

[1] مشرکین عرب کے حج بغیر اللہ اور ہندوؤں کی جاتراؤں اور مسلمانوں کے سفر زیارت میں اصول کے اعتبار سے کونسا فرق ہے۔

[2] کیا آج مسلمانوں میں عبدالرسول اور عبدالحسین اور نبی بخش اور حسین بخش اور پیر بخش جیسے نام بکثرت نہیں رکھے جاتے؟ لطف یہ ہے کہ بعض لوگ عبدالرسول نام رکھنے کی تائید میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو اپنا بندہ کہہ کر پکاریں حالانکہ قرآن میں صاف فرما دیا گیا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۱

یہ ہیں وہ قالب اور وہ صورتیں جن میں شرک اپنی روح کا اظہار کرتا ہے۔ شریعت نے اسی بنا پر ان کو ممنوع کیا ہے کہ روح شرک ہمیشہ ان قالبوں میں ظہور کرتی رہی ہے۔ پس یہ قطعی حرام ہیں خواہ ان میں شرک کی روح اور اس کی نیت ہو یا نہ ہو۔ حجۃ اللہ البالغہ

بقیہ حاشیہ ۳ بللناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین (آل عمران ۸۰) یعنی کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ جب اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ اس کا کام تو یہ کہنا ہے۔ کہ تم خدا پرست بن جاؤ۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

تالیف جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور مستند کتابوں میں سے ہے جس میں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھدیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور جیسے علامہ اجل کی شہادت ہے کہ اب تک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کردی گئی ہیں اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے:۔

۱۔ اسرار شریعت اور حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

۲۔ ہر باب کی ابتدا میں اس کے مضمون کے لحاظ سے تمام آیات قرآنیہ جمع کردی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان مطابقت واضح ہو جائے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے مذاہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب فاضل مولف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے۔ کاغذ اور طباعت بہترین ہے۔ چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں دو جلدیں عنقریب چھپکر آنے والی ہیں۔ قیمت ۶ مجلد ۵ غیر مجلد علاوہ محصولڈاک۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

مقاصد قرآن

(۲)

(از جناب مولنا صبغۃ اللہ حسینی استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد)

دین اسلام کا رکن ثانی عقیدۂ بعث بعد الموت ومکافاۃ عمل

مقاصد قرآنی میں سے دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا کو اس حقیقت پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے کہ دنیا کے فنا ہوجانے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اور پروردگار کے حضور ان کے اچھے بُرے اعمال کا حساب کتاب ہوگا، اچھوں کو اچھا بدلہ ملے گا اور بروں کو اپنی برائی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ مشرکین عرب اور دہریوں نے شدت سے اس عقیدہ کا انکار کیا، بلکہ اس پر بے حد تعجب ظاہر کیا کہ بھلا مرنے کے بعد دوسری مرتبہ انسان کیونکر زندہ ہوگا؟ گلی سڑی ہڈیاں خاک ہوجانے کے بعد بھلا کیونکر یکجا ہوجائیں گی؟ اس سلسلہ میں منکرین بعث کے جس قدر اعتراضات ہیں قرآن عزیز نے ان کو رفع فرمایا ہے۔ اور قیامت کو ثابت کیا ہے کیونکہ جزائے اعمال کا تخیل جب تک انسان کے دماغ میں نہ ہو اس وقت تک وہ خیر وصلاح کی کسی تعلیم پر کاربند ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ عقیدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے کم وبیش تمام دنیا کے مذاہب میں موجود ہے کتب الٰہیہ کے ماننے والے اس عقیدہ پر اس وقت تک برابر قائم رہے جب تک ان کی آسمانی کتابوں اور مذہب کے احکام وقوانین میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی۔ پھر جب ان کی اصلی اور حقیقی تعلیمات مسخ ہوگئیں اور دین کی روح ناپید ہوگئی تو ان لوگوں نے حیات بعد الممات اور مجازات اعمال کے عقیدہ کو ایک چیستان بنا ڈالا نصرانیوں نے کفارہ کا عقیدہ گھڑ کر یہ سمجھ لیا کہ حضرت مسیح سب انسانوں کی طرف سے سولی

چڑھ جائیں گے اب کسی قسم کے اعمال کی جزا و سزا اور باز پرس نہ کی جائے گی۔ عیسائی جو کچھ اس سلسلہ میں کہہ رہے ہیں درحقیقت وہ وہی چیز ہے جس کو ہندوستان کی بت پرست قوموں نے پیش کیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عیسائی حضرت مسیح کے کفارہ کے قائل ہیں اور وہ کرشن جی کے متعلق قریب قریب یہی خیالات رکھتے ہیں۔ رہے یہود تو انہوں نے پہلے ہی سے خدا کو صرف اسرائیل کا خدا بنا رکھا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ اس تخیل نے مجازات کے اعتقاد کو بالکل بے معنی بنا کر رکھ دیا۔ پس ضروری ہوا کہ اس عقیدہ کے متعلق بھی ان کی ایسی ہی اصلاح کی جائے جیسی الوہیت کے عقیدہ میں کی گئی تھی۔

قرآن حکیم دنیا میں اس اصلاحی دعوت کو لے کر آیا اور اس نے حیات بعد الموت اور مکافات عمل کے باب میں انسان کے تمام فاسد خیالات کی اصلاح فرمائی اور انسانوں کو اس اصلی اور بنیادی تعلیم کی طرف لوٹایا جس سے افراد بشری کی سعادت و شقاوت وابستہ تھی۔

انسانی سعادت و شقاوت کا پایہ تکمیل کو پہنچ جانا ہی درحقیقت مجازات اعمال کا باعث ہے۔ جزا و سزا کے معاملہ میں کسی قوم یا قبیلہ کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ تمام افراد نوع انسانی اس میں یکساں ہیں کیونکہ تمام اپنی فطرت کے لحاظ سے برابر ہیں۔ قرآن اس حقیقت ثابتہ کو یوں بیان کرتا ہے:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا	قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اس کو ٹھیک بنا کر
وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ	بدی اور پرہیزگاری کی سمجھ عطا کی کہ یقیناً فلاح پائی اس نے
خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔	جس نے نفس کو سنوار لیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو خاک میں ملا دیا

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو پیدا کر کے اور اس کو خوب اچھی طرح سے بنا کر عقل و شعور سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس کی فطرت میں برائی اور بھلائی، بدی اور پرہیزگاری دونوں کی صلاحیتیں موجود ہیں وہ قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کے تابع ہو کر گندگی میں بھی پڑ سکتا ہے اور ان قوتوں کو قابو میں رکھ کر انہیں ٹھیک طرح

سے استعمال کر کے پاکیزگی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ نے اسے تمیز بھی عطا فرمائی ہے کہ برائی کو بھلائی سے ممیز کر سکے اور اتنی قوت بھی بخشی ہے کہ ان صلاحیتوں میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دے سکے چاہے تو نفس کا تزکیہ کر کے ایمان اور اعمال صالحہ اور مکارم اخلاق حاصل کرے اور دنیا و آخرت میں فوز و فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہو اور چاہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھوڑ کر دونوں جگہ کی رسوائی و خواری اور ناکامی و نامرادی مول لے لے۔

یہاں یہ چیز قابل غور ہے کہ مذکورہ بالا حقیقت کو بیان کرنے سے پہلے پروردگار عالم نے سورج کی دھوپ، چاند کی چاندنی، دن کے اُجالے، رات کے اندھیرے آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی کی قسمیں کھائی ہیں یعنی ان چیزوں کو شاہد بنایا گیا ہے اس بات پر کہ خیر و شر کی دو متضاد قوتیں اسی طرح نفس انسانی میں موجود ہیں جس طرح کائنات میں ہر طرف دو متضاد اور متخالف قوتیں نظر آتی ہیں۔ پھر جس طرح خارج کی دنیا میں ان متضاد قوتوں کے باہمی تعامل اور مقابلہ سے نتائج و آثار ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح انسان میں جو متضاد قوتیں کام کر رہی ہیں ان کا مقابلہ بھی ضرور ہے کہ نتیجہ خیز ہو۔ جو شخص اس کو بے نتیجہ اور مہمل اور عبث سمجھتا ہے وہ عقل کا اندھا ہے۔ آثار فطرت کو رات دن اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اور پھر بھی ان سے سبق حاصل نہیں کرتا۔

پس معلوم ہوا کہ جزائے اعمال ایک طبعی اثر ہے جو روح و جسم کی طہارت اور گندگی کے موافق ہوتا ہے جو شخص انسان کی حقیقت سے آشنا ہو وہ ضرور اس امر کا اقرار و اعتراف کرے گا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صرف عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ ہی نہیں، بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور تمام ملتوں کے ماننے والے اس فطری عقیدہ میں جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر بھٹک چکے تھے، حالانکہ ایمان باللہ کا یہ تکملہ ہے اس لیے قرآن مجید نے اس پر بار بار زور دیا ہے اور اس کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو دلائل و براہین کے ساتھ ہی ساتھ دلنشین بھی ہے۔ اس نے طرح طرح سے مثالیں دے کے

آثار فطرت سے استشہاد کر کے، عقلی دلائل پیش کر کے اس عقیدہ کو سمجھایا ہے تاکہ یہ ذہن انسانی میں پوری طرح راسخ ہو جائے۔ غالباً وہ تمام آیتیں جن میں اس عقیدہ کی شرح و بسط سے توضیح کی گئی ہے سو سے زیادہ ہیں لیکن اس تکرار و اعادہ کے باوجود جی نہیں گھبراتا حقیقت میں یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے۔

بہرکیف مجازات اعمال کا عقیدہ تمام ادیان سماوی کا جز رہا ہے اور توحید کے مسئلہ کے لوازم میں سے ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس پر نہایت شد و مد سے کام کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ذاریات میں وجود صانع عالم پر آفاقی و انفسی نشانہائے قدرت سے استدلال کرنے کے بعد خود اپنی شان ربوبیت کو شاہد بنا کر جزائے اعمال کا ثبوت پیش کیا ہے

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ (ذاریات - ۱)

آسمان و زمین کا پروردگار شاہد ہے کہ یقیناً قیامت کا آنا حق ہے جیسا کہ تم بولتے ہو۔

یعنی خدائے تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ جیسے تمہیں اپنی قوت گویائی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا اسی طرح خدا کے وعدۂ بعث و مجازات میں بھی کسی شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں اور کائنات علوی و سفلی کی ربوبیت عامہ جس کے تحت ساری چیزیں کارفرما ہیں اسی امر کو صاف بتلا رہی ہے کہ یہ کارخانۂ تربیت یونہی بے کار اور بے فائدہ نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ یقیناً دار و گیر ہوگی۔ چنانچہ اسی سورۃ کی اگلی آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی اور قوم لوط کی بدکاری کا قصہ مذکور ہے۔ جس سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخروی مجازات دینے والا ہے جس کا کبھی کبھی ادنیٰ سا نمونہ دنیا میں بھی بتلا دیتا ہے کہ اطاعت شعاروں اور وفادار بندوں کو جزائے خیر اور نافرمان انسانوں کو ان کے کرتوتوں کے موجب سزا مل جاتی ہے۔

بعینہ اسی طرز پر سورۂ سبا میں بھی وقوع قیامت پر اہل کفر کا انکار نقل کر کے جواب دیا گیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۔ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۔

اور کافروں نے کہا کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ تم کہدو کہ میرے پروردگار کی شہادت ہے کہ ضرور تم پر قیامت آئے گی۔

یعنی ایسے حکیم مطلق کے متعلق جس نے اپنی حکمت بالغہ سے کائنات کی تربیت کا تکفل کر لیا ہے کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنا سارا نظام بے نتیجہ کردے گا اور اچھوں کو اچھی جزا اور بروں کو بری سزا نہ دے گا، کیونکہ خود ہی فرما چکا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

کیا تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاوگے۔ بادشاہ برحق خدا اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے (کہ کوئی عبث کام اس سے صادر ہو)۔

ایک دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے:۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائیگا

اور ایک مقام پر یوں صراحت فرمائی ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

ہم نے آسمان و زمین اور وہ ساری چیزیں جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کی ہیں۔ ہم نے تو ان کو مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر بہت سے لوگ بے خبر ہیں۔

آیات مذکورہ سے استدلال کا منشا صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کارخانۂ عالم کا بغیر کسی نتیجہ کے فنا ہو جانا سراسر مصلحت و حکمت کے خلاف ہوگا اور یہ شان خداوندی سے بعید ہے۔

ایک جگہ نہایت ہی عجیب پیرایہ میں انسان کے موجود ہونے کے مختلف مناظر پیش کر کے

بعث بعد الموت کے بعید از عقل ہونے کو رفع کیا جا رہا ہے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً کیا انسان منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو ٹپکائی جاتی ہے؟

فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى پھر وہ لوتھڑا ہوا پھر خدا نے اس میں جان ڈالی پھر اس

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى کی ترکیب درست کی پھر اس کے اندر نر اور مادہ کا اختلاف

پیدا کیا۔ کیا وہ خدا جس نے یہ سب کچھ کیا مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں؟

علاوہ بریں جو شخص مجازات کا منکر ہو وہ اپنے قوائے فطری سے بھی نابلد ہوگا اور ان رازہائے سربستہ سے جو اس کے وجود میں پنہاں ہیں یکسر جاہل و ناواقف ہوگا اور اس صورت میں وہ خود اپنے وجود کی تحقیر کرے گا۔ انکار آخرت لازماً انسان کو اس نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ اس کا وجود زمین پر ایک خاص مدت تک رہے گا۔ اور اس مختصر سی عمر میں مصائب و آلام اور آفات و حوادث میں گھرا رہے گا۔ اس کے بعد ساری باتیں ختم ہو جائیں گی پھر نہ تو کسی ظالم سے اس کے ظلم کے متعلق کچھ پوچھ گچھ ہوگی اور نہ کسی عادل کو اس کے عدل پر کوئی بہترین صلہ ملے گا۔

اس بارہ میں جو کچھ قرآن حکیم کی تصریحات وارد ہوئی ہیں وہ نصاریٰ کے عقائد و خیالات اور مزخرفات کے بالکل برعکس ہیں کہ انسان اخروی زندگی میں بھی ایسا ہی انسان ہوگا جیسا کہ دنیا میں تھا ہاں وہ چند پاک نفوس اور ارواح عالیہ عالم آخرت میں اپنی روحانی و جسمانی حیثیت سے کامل ہوں گی جنہوں نے دنیوی زندگی میں ریاضتیں کرکے اپنے آپ کو مشقتوں میں ڈالا اور تمام لذیذ چیزوں کو چھوڑ کر نفس کو شہوانیات سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ رہے وہ لوگ جن کے نفوس خباثتوں سے آلودہ ہوئے اور ان کی روحیں پستی میں پڑی رہیں وہ اپنی بدعملی کی کثافتوں کے باعث بالکل ناقص ہوں گے۔

یہ ایک معرکۃ الآرا بحث ہے کہ بعث بعد الموت اور مجازاۃ کا تعلق صرف روح سے ہے یا روح اور جسم دونوں سے۔ اس باب میں مذاہب و ملل کے عقائد مختلف ہیں فرض کر لو کہ اس عقیدہ مجازات کا تعلق

محض روح سے بے جسم سے نہیں ہے۔ اس مفروضہ سے اللہ تعالیٰ کی شان خلاقی میں یہ قصور لازم آتا ہے کہ جب صرف روح تمام کیفیات کی حامل ہو سکتی ہے تو پھر اس نے بلا ضرورت ایسی چیز کیوں پیدا کی جو جسم و روح کی ترکیب سے بنی ہے۔ اور جس میں اس مفروضہ کے مطابق جسم محض زائد از ضرورت ہے۔

دراصل جن لوگوں نے جسمانی لذتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور جائز جسمانی خواہشات کا نام حیوانیت رکھا وہ محض روحانی بعث کے قائل ہو گئے بعضوں نے تو جسم اور جسمانیات کی تحقیر و تذلیل میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ روح کے لیے جسم کو ایک گندہ قید خانہ سمجھ بیٹھے اور نجات کے معنی ہی یہ سمجھے کہ روح اس گندے قید خانے سے آزاد ہو جائے۔ اسی تخیل کے تحت انہوں نے رہبانیت اور جوگ کو اختیار کیا جس کا منشا یہ ہے کہ جسم کو طرح طرح کی تکلیفوں میں ڈالکر احساسات کو باطل کر دیا جائے، اور ان تمام لذتوں کا خاتمہ کر دیا جائے جو روح کو جسم کے واسطہ سے اور جسمانی تعلقات کی بدولت حاصل ہوتی ہیں۔ انہی غلط اعتقادات نے انسان کو اس نتیجہ پر پہونچایا ہے کہ جسم ایک زبردستی کا لدا ہوا ہے۔ اور حیات اُخروی محض روحانی حیات کا نام ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسمانی مادیت جب عقل و فطرت اور ہدایت الٰہی کے خلاف راستہ اختیار کرتی ہے تو وہ روح کے لیے ایک بارگراں بن جاتی ہے اور اس کو ملکوتی کمالات تک نہیں پہنچنے دیتی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جسم اور جسمانی لذات بجائے خود ایک گندگی اور نجاست ہیں اور ان کو قابل نفرت سمجھا جائے۔ خالص "مادیت" اور خالص "روحانیت" دونوں افراط و تفریط پر مبنی ہیں اور وہ اسلام ہے جس نے ان دونوں کے درمیان ایک موزون و مناسب اعتدال پیدا کیا ہے وہ انسان کو بتاتا ہے کہ روح کی ترقی سے مراد جسم سے روح کی آزادی نہیں ہے، بلکہ جسم اور جسمانیات پر عقل اور عقلیات کی کامل حکومت قائم ہو جانے کا نام ترقی روحانی ہے انسان جب دنیا میں خدائی ہدایت کے تحت اس حکومت کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے کامیاب جدوجہد کر چکتا ہے تو آخرت کی زندگی میں اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن و سنت کے نصوص پر جو شخص غور کرے گا اس پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ آخرت کی زندگی میں روحانی قوی اجسام

پوری طرح غالب ہوں گے اور انسان اس قدر طاقتور ہو جائے گا کہ جو کچھ وہ چاہے گا وہی ہوگا، اس کی نگاہ تیز ہوگی، اس کی سماعت قوی ہوگی، وہ ہمہ تن گویائی بن جائے گا وہ ہر چیز سے بات کرے گا۔ اور ہر چیز کی بات سنے گا اور وہ تقییدات باقی نہ رہیں گے جو اس دنیا میں اس پر چھائے ہوئے ہیں۔

جو لوگ ان باتوں پر اچنبھا ظاہر کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ خود اس دنیا میں مادی قوتوں پر بہت ادنیٰ درجہ کی حکومت حاصل کر کے انسان وہ وہ کام کر رہا ہے جن کو کچھ مدت پہلے ہی انسان ناممکن سمجھتا تھا۔ آج ہندستان میں بیٹھ کر یورپ و امریکہ کے دور دراز ممالک سے نہ صرف گفت و شنید ہو سکتی ہے اور خطبے سنے جا سکتے ہیں بلکہ گفتگو کرنے والوں کی شکلیں بھی نظر آنے کے لیے آلات ایجاد ہو چکے ہیں۔ پس کیونکر ان حقائق اسلامیہ کا انکار کیا جا سکتا ہے جو عالم آخرت اور اس کی کیفیات کے متعلق قرآن عزیز نے پیش کئے ہیں۔
(باقی)

مسلمانوں کے موجودہ انحطاط پر ایک نظر

از جناب خان بہادر محمد ذکاء اللہ خان صاحب دیوان ریاست دتیہ

اسلام میں عمل کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ خداوند جل وعلیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کا قریب قریب ہر جگہ ذکر فرمایا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ایمان کے بعد ایک مومن کے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ عمل صالح ہے۔ مثلاً۔

(۱) فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ۝ (سورہ قصص رکوع)

(۲) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ (سورہ عنکبوت رکوع ۱)

(۳) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ (ایضاً)

(۳) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۔ (ایضاً رکوع ۶)

(۵) فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ۔ (سورہ روم رکوع ۲)

(۶) إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سورہ احقاف رکوع ۲)

کلام پاک کی مندرجہ ذیل آیت جس میں حضور پر نور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام کی زندگی کا نقشہ وجد پیدا کرنے والے الفاظ میں کھینچا گیا ہے، اس میں بھی عمل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:۔

(۲) مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَٰنًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ الصَّٰلِحَٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًۢا ۔ رکوع ۱۲

آیات مندرجہ بالا کے مطالعہ سے قارئین کرام پر واضح ہو گیا ہو گا کہ کلام پاک ایمان کے ساتھ عمل کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور کیوں نہ دے جبکہ حکمت خداوندی کا مقتضا ہی یہ تھا کہ امت محمدیہ خیر امۃ، اور امۃ وسطاً اور شہداء للہ علی الناس ہو اور اپنے اعمال صالحہ کے لحاظ سے تمام امم سابقہ پر فوقیت لے جائے۔

اور عقلاً بھی عمل کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ ایمان کا معاملہ تو بندے اور اس کے مولیٰ کے درمیان ہے۔ وہ ہمارے قلوب کا دیکھنے والا علیم بذات الصدور ہے بس اگر ہم سچے دل سے نور حق کے متلاشی ہوں تو وہ ہماری کمی یا لغزش ایمانی کو معاف کرنے والا ہے۔

لیکن ہمارے اعمال کا اثر خود ہماری ذات پر پڑتا ہے، ہماری اولاد پر پڑتا ہے، ہمارے کنبہ اور قبیلہ پر پڑتا ہے بلکہ کافۃ المسلمین اور کافۃ الناس پر پڑتا ہے۔ اس لیے جس قدر بھی عمل کو اہمیت دی جائے وہ تھوڑی ہے۔ ہم مسلمان اگر اپنے نیک اعمال اور ستودہ خصائل کی بنا پر اپنے آپ کو دوسری اقوام اور دیگر مذاہب کے متبعین کے مقابلہ میں برتر اور بہتر ثابت کر دیں تو ہم دنیا میں اسلام کا سچا نمونہ، اور اس کی حقانیت کا زندہ ثبوت بن جائیں گے، لوگ خود بخود ہمارے دین کی طرف کھنچنے لگیں گے اور ہمارے عین وجود سے اللہ کا کلمہ بلند ہو گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم من حیث القوم اپنی بداعمالیوں اور اخلاق ذمیمہ کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں گرا دیں گے

تو ہم نہ صرف اپنی ہی تذلیل کا باعث ہوں گے بلکہ دین اسلام کی توہین کا سبب بھی بن جائیں گے۔ ہمارے اسلاف نے جو اقصائے عالم میں اسلام پھیلایا تو ان کے پاس اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے قوی تر کیا ہتھیار تھا؟ یہی ان کے نیک اعمال اور ستودہ اخلاق چین میں اسلام کبھی فاتحانہ حیثیت سے نہیں گیا مگر وہاں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچی ہے۔ جزائر ہند مثلاً جاوا، سماٹرا، بورنیو وغیرہ میں بھی اسلام محض اہل اسلام کی عملی اور اخلاقی فوقیت کی بنا پر پھیلا۔ ان مشرقی جزائر میں سے ایک جزیرہ میں اسلام کی اشاعت کے متعلق جو روایت ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے یہاں اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جب میں اس جزیرہ میں پہونچا تو میں نے ساری آبادی کو مسلمان پایا۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کیونکہ جہانتک مجھ کو علم تھا مسلمان اس جزیرہ میں فاتحانہ یا تاجرانہ حیثیت سے کبھی نہیں پہونچے تھے تحقیقات سے جو روایت اہل جزیرہ کے اسلام لانے کی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ

عربوں کا کوئی تجارتی جہاز حسب معمول مشرق اقصیٰ کی طرف تجارت کی غرض سے جا رہا تھا۔ اثناء سفر میں جہاز انہی مشرقی جزائر کے قریب تھا کہ سمندر میں سخت طوفان آیا۔ جہاز تباہ و برباد ہو گیا۔ اور اس تباہ شدہ جہاز کے مسافروں میں سے ایک شخص ایک تختہ پر بیٹھا ہوا بچ گیا اور اس کا تختہ اسی جزیرہ کے کنارے جا لگا۔ یہ شخص ایک مراکشی عرب تھا۔ اور اس جزیرہ میں کوئی اسکا یار و مددگار نہ تھا۔ اس نے اس جزیرہ میں ایک بڑھیا کے گھر پناہ لی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور اس کو فروخت کرتا۔ اسی طرح وہ ایک عرصہ تک اپنی بسر اوقات کرتا رہا

ایک روز حسب معمول جب یہ عرب جنگل سے لائی ہوئی لکڑیاں بازار میں بیچ کر بڑھیا کے گھر پہونچا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا اور اس کی نا کتخدا جوان لڑکی بہت سخت جزع و فزع میں مصروف ہیں۔ عرب نے ان سے ان کے رونے دھونے کی وجہ دریافت کی تو بڑھیا نے بیان کیا کہ

ہمارے اس جزیرہ میں ہر مہینہ کی یک معین تاریخ کو سمندر کے کنارے ایک بلا نمودار ہوتی ہے۔ جزیرہ اور اہل جزیرہ کو اس بلا کے اثرات بد سے بچانے کا یہ طریقہ عرصہ سے چلا آتا ہے کہ تاریخ مقررہ پر ایک دوشیزہ لڑکی جزیرہ والوں کی طرف سے غروب آفتاب کے بعد ایک مندر میں جو سمندر کے کنارے ہے حکومت کی طرف سے پہونچا دی جاتی ہے۔ دوسرے روز صبح کو جب حکومت کے آدمی اس لڑکی کو لینے جاتے ہیں تو وہ لڑکی مردہ ملتی ہے اور اس کی بکارت زائل شدہ پائی جاتی ہے۔ ہر سال قرعہ اندازی سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کونسی لڑکی بھیجی جائے۔ یہاں تک بیان کرنے کے بعد بوڑھیا اور زیادہ روئی اور کہا کہ اس مرتبہ قرعہ میری لڑکی کے نام نکلا ہے جو میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس وجہ سے ہم دونوں اس رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں۔

عرب نے یہ دردناک داستان سنکر بڑھیا سے کہا کہ اور تو میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا لیکن اگر اس طرح تمہاری لڑکی کی جان بچ سکے تو میں تمہاری لڑکی کے بجائے بلا پر بھینٹ چڑھنے کے لیے مندر پر جانے کو تیار ہوں۔ تم مجھ کو اپنی لڑکی کے زنانہ کپڑے پہنا دینا تاکہ مجھکو کوئی پہچان نہ سکے۔ یہ عرب صاحب ان مردوں میں سے تھے جن کے ڈاڑھی مونچھ نہیں ہوتی یا قریب صفر کے ہوتی ہے۔ چنانچہ بڑھیا نے عرب صاحب کی تجویز کو منظور کر لیا۔ اور ان کو اپنی لڑکی کے زنانہ کپڑے پہنا دیئے۔ جب حکومت کے سپاہی بڑھیا کی لڑکی کو لینے آئے تو اس نے اُن عرب کو اپنی لڑکی کے بجائے سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہی حسب دستور اس عرب کو اس مندر پر لے گئے اور وہاں بٹھا کر واپس چلے آئے۔ یہ عرب صاحب حسن اتفاق سے حافظ قرآن بھی تھے اور ان کو اس کے انکشاف کا شوق بھی تھا کہ یہ کیا بلا ہے جو دوشیزہ لڑکیوں کی بکارت زائل کر دیتی ہے اور ان کی موت کا باعث ہوتی ہے

چنانچہ ان عرب صاحب نے وضو کیا، نماز پڑھی، اور بعد نماز کے بآواز بلند نہایت اطمینان کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف ہوگئے۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بجے کے قریب افق کی طرف سے کوئی جہاز کی شکل کی چیز نمودار ہوئی جس میں خانے ہی خانے تھے اور سب خانے روشن تھے۔ یہ شے آہستہ آہستہ جزیرہ کے کنارے تک آکر رک گئی۔ اور یہ عرب صاحب بدستور اپنی تلاوت قرآن پاک میں مصروف رہے۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر وہ شئے جس طرف سے آئی تھی اسی طرف آہستہ آہستہ واپس چلی گئی اور پھر نظر سے غائب ہوگئی۔ ان کو کوئی گزند نہیں پہونچا یا۔ صبح کو جب حکومت کے سپاہی بزعم خود اس لڑکی کی نعش لینے آئے تو دیکھا کہ لڑکی صحیح و سالم بیٹھی ہے۔ سپاہیوں کو سخت تعجب ہوا اور اس لڑکی کو جزیرہ کے راجہ کے پاس لے گئے۔ راجہ نے جب ان سے جرح کے سوالات کیئے تو عرب صاحب کو کل قصہ بیان کرنا پڑا۔ انہوں نے کہا کہ میں بڑھیا کی لڑکی کے بجائے سمندر کے کنارے چلا گیا تھا۔ کیونکہ بڑھیا نے مجھکو اپنے گھر ٹھیرا کر مجھپر احسان کیا تھا۔ اور میرے مذہب میں احسان کا بدلہ احسان ہے۔ راجہ پر ان کی اس تقریر کا بہت بڑا اثر پڑا۔ اس نے دریافت کیا کہ تمکو ایسے خوف کی جگہ جاتے ہوئے ڈر نہیں معلوم ہوا؟ عرب صاحب نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو سوائے خدا کے کسی سے ڈرتے ہی نہیں۔ عرب صاحب کے اس جواب اور ان کے عمل سے راجہ اور اس کے اہل دربار بہت متاثر ہوئے لیکن راجہ نے عرب صاحب سے کہا کہ اگر اگلے مہینے کی تاریخ مقررہ پر تم پھر اسی مندر پر جاؤ اور وہاں سے صحیح و سالم آجاؤ تو ہم تمہارے معتقد ہوجائیں گے۔ انہوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ چنانچہ آئندہ مہینہ کی تاریخ مقررہ پر یہ پھر اسی مندر پر گئے اور صحیح و سالم واپس آگئے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ راجہ مع کل اہل جزیرہ کے مسلمان ہوگیا۔

اس روایت سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان ایسا اخلاق، ایسا عمل اور ایسی قوتِ ایمان رکھتے تھے کہ ان میں کا ایک فرد بے یار و مددگار ایک غیر معروف جزیرہ میں اپنے جہاز کے تباہ ہونے کی وجہ سے پہونچتا ہے اور محض اپنی اخلاقی طاقت سے ایک قوم کی قوم کو مسخر کر لیتا ہے۔ وہ بے وسیلہ اور غریب الدیار ہونے کے باوجود در بدر بھیک نہیں مانگتا پھرتا، بلکہ اپنی قوتِ بازو سے روزی کماتا ہے۔ پھر وہ اپنی احسان شناسی، ایثار، جرأت، خدا پرستی اور کمالِ ایمانی کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے کہ وہ لوگ جن کے درمیان وہ بالکل اجنبی تھا، اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے دل خود پکار اٹھتے ہیں کہ جس مذہب کی تعلیم انسان کو اس قدر بلندی عطا کر دیتی ہے وہ یقیناً سچا مذہب ہی ہوگا۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب مختلف تمدن آپس میں ٹکراتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کا تمدن اپنے سے افضل اور اعلیٰ درجہ کے تمدن میں جذب اور مدغم ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس اعلیٰ تمدن میں اس قدر رواداری ہو کہ وہ اپنے سے کم متمدن اقوام کو اپنے میں برادرانہ حیثیت سے داخل کرے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں یہ دونوں صفتیں موجود تھیں۔ اہلِ عرب کی تاریخ شاہد ہے کہ جہاں جہاں عرب گئے خواہ فاتحانہ حیثیت سے یا تاجرانہ ان سب ممالک کی گویا بالکل ہی کایا پلٹ ہو گئی۔ ایران کو لو یا شام کو، مصر کو لو یا مراکش کو عربوں کے ان ممالک میں پہونچتے ہی وہاں کے باشندوں میں ایک نئی روح دوڑ گئی، اسلام کے رنگ میں رنگ گئے اور بجائے عربوں کے خود علم برداران اسلام بن گئے۔ عربوں کے سوا دیگر فاتحین اسلام مثلاً عثمانی ترک یا تیموری مغل اپنے ممالک مفتوحہ میں ذمی اقوام کی ایسی کایا پلٹ نہ کر سکے جیسی عربوں نے کی تھی۔

یہ کیوں تھا؟ محض اس لیے کہ اہلِ عرب نے اس سرچشمۂ ہدایت یعنی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دولتِ ایمان کے ساتھ حسنِ اخلاق و اعمالِ صالحہ کی دولت بھی حاصل کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیا ملحاظ عقیدہ و اخلاق

اور کیا لحاظ علم و عمل اہل عرب جملہ اقوام عالم پر فوقیت لے گئے۔

وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی ہمعصر اقوام سے اعلیٰ اور افضل تھے۔ اگر فن جنگ میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا تو فن تجارت و فلاحت میں بھی کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام پر مشرق و مغرب کے درمیان جو سلسلہ تجارت تھا وہ سب عربوں کے ہاتھ میں تھا۔ ہندوستان اور خلیج فارس سے جملہ اموال تجارت اہل عرب ہی کے ذریعہ سے عرب کے جہازوں پر سسلی اور جنوبی یورپ میں پہنچتا تھا۔ اور اگر کسی قوم کے جہاز بحر ہند میں اپنا پھریرا اڑاتے پھرتے تھے تو وہ صرف عرب قوم ہی کے تھے۔ وہ اوقاف کی روٹیاں کھانے اور وظیفوں اور منصبوں اور جاگیروں پر گزر کرنے کے خوگر نہ تھے بلکہ اس حال میں سخت جد و جہد کرتے تھے۔ ان کے دل ایمان سے معمور تھے اور ان دلوں کے لیے ہوئے وہ ابتغائے فضل رب کے لیے دنیا کے گوشے گوشے میں حرکت کرتے پھرتے تھے اور ان کی حرکت کے ساتھ ان کی تہذیب ان کا تمدن، ان کے افکار و علوم ان کے اصول اخلاق بھی چار دانگ عالم میں پھیلتے چلے جاتے تھے۔

پھر علمی حیثیت سے دیکھیے اس زمانہ میں جملہ اقوام عالم جہالت اور ذلت کے قعر عمیق میں پڑی ہوئی تھیں تمام یورپ کلیسائے مسیحی کے ظلم و استبداد کا شکار بنا ہوا تھا کسی کو پوپ اعظم اور کلیسائے روم کے فتووں کے خلاف دم مارنے کا حق حاصل نہ تھا عوام کو مذہبی امور میں کلیسائے روم کے احکام کی مثل وحی آسمانی کے پابندی کرنی لازم تھی اور اپنی رائے اور اجتہاد کو دخل دینے کا کوئی مجاز حاصل نہ تھا۔ مذہبی علوم کی درس و تدریس ایک مخصوص مذہبی گروہ تک محدود تھی اور عوام کسی قسم کی کوئی علمی تحقیقات بلا اجازت کلیسائے روم نہیں کرسکتے تھے۔ معتقدایان مذہبی کی تنگ خیالی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ گیلی لیو (Galileo) نے جب یہ دعویٰ کیا کہ زمین گول ہے تو کلیسائے روم کی طرف سے اس کے خلاف یہ فتویٰ صادر ہوا کہ وہ جلا کر خاکستر کردیا جائے۔ مذہبی عقیدت اور تنگ خیالی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ (Absolution) یا معافی ناموں کی مثل دیگر اشیاء فروختنی کے کلیسائے روم اور اس کے حوارئین کی طرف سے خرید و فروخت

ہوتی تھی۔ صفائی اور طہارت کے متعلق عیسائی دنیا میں اس قسم کے خیالات راسخ ہو چکے تھے کہ ہر قسم کی طہارت اور صفائی کفر اور الحاد کے مترادف تھی۔ چنانچہ بہت سے مذہبی پیشوا اس بات کو بہت فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ مدت العمر میں انگلیوں کی پوروں کے سوا ہمارے کسی حصہ جسم کو کبھی پانی نہیں لگا۔ اور اسی کے ساتھ عیسائی دنیا میں یہ خیال بھی راسخ تھا کہ بنی نوع انسان کا نصف طبقہ یعنی طبقۂ نسوان روح انسانی سے معرّیٰ ہے۔

ایک طرف یورپ کی مذہبی دنیا کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف مشرق قریب یعنی ہندوستان میں بھی مذہبی دنیا کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ یہاں اگرچہ کسی زمانہ میں فلسفہ اور علم دین نے بہت کچھ ترقی کی تھی مگر ظہور اسلام کے وقت ہندوستان پر بھی گمراہی اور جہالت کے بادل چاروں طرف سے چھائے ہوئے تھے۔ علم دین کا پڑھنا پڑھانا صرف ایک گروہ (یعنی برہمنوں) کے ساتھ مخصوص تھا۔ طبقۂ نسواں اور تمام ان اقوام کے لیے جو دویج جاتی کے محدود حلقہ سے باہر تھیں، ویدوں کا پڑھنا پڑھانا تو درکنار چھونا تک ناجائز تھا۔ منوسمرتی کے مطابق اگر وید کا کوئی شبد (لفظ) کسی شدر کے کان میں پڑ جائے تو وہ اس سزا کا مستوجب تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ دویج جاتیوں میں بھی صرف برہمن ہی ویدوں کو پڑھ اور پڑھا سکتے تھے۔ پوجاپاٹ میں برہمنوں کا توسل ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ پادریوں کا عیسائی دنیا میں۔

غرض بندہ اور مولیٰ کے درمیان بلاواسطہ رشتہ نہ عیسائی دنیا میں قائم تھا اور نہ ہندوستان میں۔ ذاتی تحقیق و تدقیق کا دروازہ جیسا کہ مغرب میں بند تھا ویسا ہی مشرق میں۔ یہ اسلام ہی تھا کہ جس نے از سر نو عبد و معبود کے رشتہ کو جوڑا اور کافۃ الناس کے سامنے یہ زرین اصول پیش کیا کہ بندہ اپنے مولا سے تقویٰ اور نیک اعمال کی بنا پر کسی کے توسل کے بغیر قربت حاصل کر سکتا ہے۔

عقائد اسلام کے مطابق کسی شخص کی نجات (Salvation) باکلی اس پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نبی، ولی یا نعوذ باللہ ابن اللہ سولی پر چڑھے تب اس کی امت کو نجات حاصل ہو بلکہ اسلام کے نزدیک انسان کی نجات اپنے ذاتی اعتقادات اور اعمال پر منحصر ہے۔ اس طرح اسلام نے ہر مسلم کو اپنے اعمال و

انمال اور اعتقادات کا خود ذمہ دار قرار دیکر ہر مسلم پر باب اجتہاد اور اسی کے ساتھ باب تحقیق و تدقیق واکردیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرون اولی کے مسلمانوں اور خصوصاً اہل عرب نے جہاں کہیں علم و حکمت کا سرچشمہ پایا، دور دراز کا سفر کرکے اس سے سیراب ہوئے۔

عربوں نے نہ صرف قدیم یونانی علم و حکمت کا احیار کیا بلکہ خود ایک جدید سائنٹفک دور کی بنیاد ڈالی اور علم و عمل کے آسمان پر آفتاب اور ستارے بن کر چمکے۔ عمل کے میدان میں جہاں خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ بن الجراح ہمیشہ دنیا سے خراج تحسین وصول کرتے رہیں گے۔ وہاں علم و حکمت کے میدان میں غزالی، ابن رشد، رازی، اور ابن سینا باعث رشک ہستیاں ثابت ہوں گی۔

اس وقت کے عربوں کی علم و حکمت کی تلاش اور علمی ترقی کا جو خاکہ مولانا حالی نے اپنے مسدس کے چند لاثانی بندوں میں کھینچا ہے ان میں سے شروع اور آخر کا بند ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے :-

وہ لقمان و سقراط کے دُر مکنون وہ اسرار بقراط و درس فلاطون
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانون پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفون
یہیں آکے مہر سکوت انکی ٹوٹی
اسی باغ رعنا سے بو ان کی پھوٹی

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت طبیعی الٰہی ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت سیاحت، تجارت، عمارت، فلاحت
لگاؤ گے کھوج ان کا جاکر جہاں تم
نشان ان کے قدموں کا پاؤ گے واں تم

ان علم و حکمت کے شیدائیوں نے نہ صرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو علم و حکمت کی ہر صنف میں معراج ترقی پر پہونچا یا بلکہ سائنٹفک تحقیقات کی راہیں دیگر اقوام عالم کیواسطے بھی کھولدیں۔ وہ جمود جو تمام اقوام

عالم پر طاری تھا محض اُس آزاد خیالی کی وجہ سے جو فضاء عالم میں اسلام نے پیدا کی تھی ٹوٹ گیا۔
جب اسلام جنوبی یورپ اور اسپین میں عیسائیت سے ٹکرایا اور اسلامی آزادی اور حریت کی ہوا عیسائی دنیا میں پھیلی تب ہر شخص نے محسوس کیا کہ مذہبی امور میں ذاتی رائے اور اجتہاد ہر شخص کا فطری حق ہے۔ عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہوا کہ کلیسا روم نے جو طوق غلامی اُن کی گردنوں میں ڈال رکھا ہے وہ انسان کی فطری آزادی اور حریت کے بالکل منافی ہے۔ اس نے کلیسا کے صدیوں کے ظلم و استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے جرمنی میں پہلی مرتبہ پوپ اعظم اور کلیسا روم کے خلاف اس بغاوت کی ابتدا کی اور اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی دنیا میں پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقہ کی بنیاد پڑی عیسائی دنیا کی یہی ذہنی آزادی یورپ کی آجکل کی سائنٹیفک اور مادی ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔

اسلام سے یہ آزادی کی لہر نہ صرف یورپ میں دوڑی بلکہ ہندوستان کی مذہبی دنیا بھی اس کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ مذہبی تحریکیں جن کے بانی گرونانک کبیرداس، رام موہن رائے ہوئے ہیں سب اسلامی تعلیمات کی رہین منت ہیں۔ سب سے آخری مگر سب سے زیادہ ناشکر گذار مذہبی تحریک یعنی آریہ سماج بھی اسلامی عقائد کی تعلیم سے مستفید ہوئے بغیر نہ رہی اور اگرچہ وہ کبھی اس کا اعتراف نہ کرے گی مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے بار منت سے سبکدوش ثابت نہیں کر سکتی۔

مگر افسوس ہے کہ جس اسلام نے اقوام عالم کے قوائے ذہنی کو جمود کی بلا سے نجات دلائی اس کے نام لیوا خود اسی بے حسی اور جمود کا شکار بن گئے۔ انہوں نے تمام دنیا کی عقل اور قوت اجتہاد کو مذہبی پیشواؤں کے بے جا تشدد اور استبداد سے آزادی بخشی مگر خود اپنے اوپر ہر قسم کی علمی و عملی ترقی کا دروازہ اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدتر طریقہ پر بند کر لیا۔

ہمارے مذہبی پیشواؤں کا نقطۂ نظر مذہبی معاملات یا علمی تحقیقات کے متعلق عجیب حیرت انگیز ہے

غیر مذہب والوں کو جب ہمارے مقتدا دین اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو بڑی شد ومد کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں اور بجا طور پر دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو عقل کی کسوٹی پر پورا اُتر سکتا ہے۔ مگر جوں ہی وہ غیر مسلم اسلام کی ذاتی خوبیوں اور عقل کی کسوٹی پر پورے اترنے والے اصولوں سے بجا طور پر متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے ہمارے پیشوایان دین کی طرف سے اس کو فتویٰ سنا دیا جاتا ہے کہ اب بحیثیت مسلمان ہونے کے تم کو ذاتی اجتہاد اور عقل سے کام لینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اب تمہاری مذہبی معلومات کا انحصار صرف نقل پر ہے۔ اب اگر تم نے مذہبی امور میں نقل کے مقابلہ میں عقل کو دخل دیا تو تم گمراہ ہوئے۔ یہ فتویٰ سن کر وہ بیچارہ سخت مخمصہ میں پڑ جاتا ہے کہ ابھی کیا تھا اور ابھی کیا ہو گیا۔[له]

له ترجمان القرآن: یہاں ایک بات کی تشریح ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ انسان کو عقلی تنقید کا حق اس حد تک ضرور حاصل ہے کہ وہ خوب جانچ پڑتال کر دیکھے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں یا نہیں، اور قرآن حکیم کتاب برحق ہے یا نہیں، اور اسلام کے بنیادی اصول صحیح ہیں یا نہیں۔ مگر جب عقلی تنقید کے بعد وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور کلام اللہ کی حقانیت پر ایمان لا کر مسلمان ہو جائے، تو خود عقل ہی کا یہ اقتضا ہے کہ اس کو رسول اللہ اور قرآن کے ایک ایک حکم پر تنقید کرنے کا حق باقی نہ رہے۔ اب اگر وہ یہ کہے گا کہ رسول اللہ اور قرآن کی جس بات کو میری عقل قبول نہ کرے گی اسے میں نہ مانوں گا، تو گویا وہ خود ہی اپنے دعوئے ایمان بالرسالت و ایمان بالقرآن کی تکذیب کرے گا، کیونکہ رسول کو رسول بھی ماننا اور پھر اس کے احکام میں چون وچرا بھی کرنا، قرآن کو کتاب اللہ بھی ماننا اور اس کی آیات پر تنقید بھی کرنا، ایک کھلا ہوا متعارض طرز عمل ہے جس کو ہر صاحب عقل ادنیٰ تامل سے سمجھ سکتا ہے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ عقلی نہیں ہے کہ وہ قرآن کی تعلیم اور رسول اللہ کے ثابت شدہ احکام کے آگے سر جھکا دے۔ اس کے سوا اسلام کا اور کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ البتہ مسلم کو اپنی عقل اور اپنا اجتہاد اور اپنی تحقیق صرف اس حیثیت سے استعمال کرنے کا حق ہے کہ قرآن میں فلاں تعلیم جو دی گئی ہے، یا فلاں بات جو بیان فرمائی گئی ہے اس کا صحیح مطلب کیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فلاں بات جو منقول ہے، آیا وہ آپ سے ثابت ہے یا نہیں، اور اگر ثابت ہے تو اس کا حقیقی منشا اور مقصد کیا ہے۔ یہ حق بلاشبہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اور ہر مسلمان کو پوری آزادی بخشی گئی ہے کہ اس حق کو استعمال کرنے کی استعداد بہم پہونچائے اور اس کے ذرائع سے استفادہ کرے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اس سے قارئین کرام پر بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا کہ آجکل کے مسلمانوں کی بعینہٖ وہی حالت ہے جو قرون وسطیٰ میں عیسائی دنیا کی تھی۔ مسلمانوں کی ذہنی آزادی اور قوت اجتہاد ان سے سلب کر لی گئی ہے بلکہ اکثر علماء کا خیال ہے کہ ائمۂ اربعہ کے بعد مسلمانوں پر کم از کم عملی طور پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ ہر قسم کی علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا دروازہ مسلمانوں پر مسدود ہے۔ اور آج جبکہ دیگر اقوام عالم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات میں اوج کمال تک پہنچ چکی ہیں، مسلمان علماء کے نزدیک یہ مسئلہ ابھی تک بحث طلب ہی ہے کہ آیا مسلمانوں کو جدید سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیے بھی یا نہیں۔ میں گمان کرتا ہوں کہ اکثر علماء کی رائے، جدید سائنس کی تعلیم کے خلاف ہی ہو گی۔ ممکن ہے کہ کسی عالم کی رائے اس تعلیم کے موافق بھی ہو مگر عملی حیثیت سے تو قریب قریب، بلکہ تمام سائنس کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ چنانچہ ہمارے عربی مدارس میں سے کسی میں بھی سائنس کی تعلیم نہیں دیجاتی اور نہ علماء میں سے کسی کو جدید سائنس کے حصول اور اس کے ذرائع کی فکر و تلاش ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں سے ان کی ذہنی آزادی کا چھن جانا، علمی اور سائنٹفک تحقیقات سے ان کا باز رکھا جانا اور علمی حلقوں میں اس خیال اور اعتقاد کا سرایت کر جانا کہ جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں اس پر ہم کچھ اضافہ نہیں کر سکتے اور ہمارا یہ سمجھ لینا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اور ہم میں سے قوت عملیہ کا مفقود ہو جانا جس کی اہمیت میں اس مضمون کی ابتدا میں نصوص سے واضح کر چکا ہوں ساتھ ہی ہم میں تن آسانی و آرام طلبی اور محنت و مشقت سے گریز پیدا ہو جانا، مزید براں دینی اور دنیوی تعلیم کی

تکملہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰ پس علماء کے خلاف اگر کوئی شکایت بجا طور پر کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں سے اس حق کو سلب کر لیا، اور خود اپنے آپ کو بھی اس سے محروم بنا لیا، اور تحقیق و اجتہاد کے تمام حقوق ایک خاص زمانہ کے ائمہ کے لیے مخصوص کر دیے حالانکہ نہ ان ائمہ نے اس تخصیص کا دعویٰ کیا، نہ خدا اور رسول نے اس کا حکم دیا، نہ کوئی عقلی دلیل اس پر قائم ہوئی۔

ایک دوسرے سے بے تعلقی، علماء کے گروہ کا فروعی اور غیر ضروری مختلف فیہ مسائل میں انہاک، عبادات اور محض عبادات ہی کا اصل مذہب سمجھا جانا، اور یہ خیال کر لینا کہ طلب معاش اور اکل حلال طلب دنیا کے مترادف ہیں اور دنیا جیفہ ہے یہ اور اس قسم کے دوسرے خیالات ہمارے زوال اور انحطاط کا باعث بنے ہوئے ہیں اور یہی وہ خاص اسباب ہیں جن کی بنا پر ہم روز بروز قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔

پس جب تک کہ ہم کو ہماری ذہنی آزادی پھر واپس نہیں ملیگی اور ہر قسم کی علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار نہ دیا جائے گا اور جب تک کہ اس خیال کی بیخ کنی نہ کی جائے گی کہ باب اجتہاد ہم مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے، اس وقت تک ہم مسلمان موجودہ انحطاط سے ترقی کی طرف کبھی گامزن نہ ہو سکیں گے۔

بند شدہ دروازۂ اجتہاد کے کھولنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سب غیر مقلد بن جائیں اور تمام قیود سے آزاد ہو کر اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ بجانے لگیں۔ نہیں سلف کا اتباع تو ہم بہر حال کریں گے اور ہم کو کرنا چاہیے لیکن باب اجتہاد کو بند کرنے سے جو جمود ہم میں پیدا ہو گیا ہے، اس کا توڑنا یقیناً ضروری ہے۔ اور جب تک وہ نہ ٹوٹے گا ہم ہرگز ابھر نہ سکیں گے

اگر علما اور دیگر اہل الرائے حضرات کو راقم الحروف کی تشخیص مرض سے اتفاق نہ ہو تو وہی ہم کو بتائیں کہ آخر ہمارے جمود و انحطاط کے اصلی اسباب کیا ہیں۔ اور ہم کس طرح ان کو دور کریں۔ مجھے اپنی تشخیص پر اصرار نہیں۔ جو آپ کی رائے میں صحیح تشخیص اور تدبیر علاج ہو وہی کیجیے ہمارا مطلب تو یہ ہے کہ اس مصیبت کو سمجھنے اور دور کرنے کی کوئی فکر کی جائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں اور افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ علماء میں کبھی یہ بحث ہی نہیں چھڑتی کہ مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ جو رسائل اور جرائد علماء کے زیر اثر نکلتے ہیں ان میں یہ بحثیں تو ضرور دیکھنے میں آتی ہیں کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا یا نہیں، یا انعقاد مجالس

میلاد جائز ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ خلفاء اربعہ میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے لیکن اس کی بحث کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت کو کیوں پہنچے اور اس پستی سے ان کو نکالنے کا کوئی طریقہ ہے بھی یا نہیں، کبھی ان مذہبی جرائد میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ غور طلب یہ امر ہے کہ ہمارے علماء کو اس امر کا احساس ہے بھی یا نہیں کہ مسلمان آجکل پستی کی کس حالت تک پہنچ گئے ہیں؟ اگر ہے تو کبھی وہ اس کے اسباب پر غور فرماتے ہیں؟ اور اس کا کوئی علاج تجویز کرتے ہیں؟ اگر تجویز فرماتے ہیں تو وہ تجویز کیا ہے؟

اگر میں اس تحریر کے ذریعہ سے علماء کے گروہ میں یہ احساس پیدا کر سکوں کہ مسلمان اور اسلام اب گرتے گرتے خطرہ کی حالت تک پہنچ چکے ہیں اور یہ کہ اس زوال کے اسباب پر غور کرنے اور اس کا علاج تجویز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ کہ یہ کام تمام ان فروعی اور غیر ضروری مباحث سے جو علماء کے مختلف گروہوں کے درمیان آج کل معرکۃ الآراء مباحث ہیں بہت زیادہ اہم اور بہت زیادہ ضروری ہے، تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ سعی اگرچہ وہ بہت ہی حقیر ہے سعی مشکور ثابت ہوئی۔

والسعی منی والاتمام من اللہ

محدثین اور فقہ

از جناب مولوی جانباز محمد خاں صاحب محمدی حیدرآباد

بعض حضرات کا یہ کہنا کہ محدثین کرام ناقل تھے، نہ ان کو ناسخ منسوخ کا علم تھا نہ راجح مرجوح کا نہ تفقہ ان کا اصل موضوع تھا بلکہ وہ احادیث کو محض رٹ لیتے تھے' ایک ایسا دعوی ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ رجال کی دیکھ بھال سند و متن کی شناخت کے علاوہ احادیث میں غور و خوض کرنا راجح و مرجوح، ناسخ و منسوخ پر وقوف حاصل کرنا مضامین قرآنی اور احادیث صحیحہ میں توفیق دینا محدثین رحمہم اللہ کا اصل موضوع تھا جو اہل علم پر پوشیدہ نہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ محدثین اہل الرائے کی فقاہت (ظن و تخمین) کے بالکل خلاف تھے۔ ان کی فقاہت کا دائرہ قرآن و حدیث تک محدود تھا۔ اس سے زیادہ دائرہ فقاہت کو وسعت دینا وہ شریعت محمدیہ کے منافی سمجھتے تھے۔

یہاں ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں صرف چار معتبر اور موثق و موتمن گواہ پیش کرتے ہیں۔ اُمید کہ ناظرین کرام بنظر انصاف غور فرمائیں گے۔ ہاں یہ ذہن نشین رہے کہ ہمارا یہ طریق شخصیت پرستی کے تحت نہیں بلکہ خدا پرستی کے تحت ہے۔ واستشھدوا شھیدین من رجالکم

پہلے گواہ علامہ ابن خلدون ہیں جو مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں۔

انقسم الفقه فيهم الى طريقين طريقة اهل الرأى والقياس وهم اهل العراق وطريقة اهل الحديث وهم اهل الحجاز وكانَ الحديث قليلاً فى اهل العراق لما قدمناه فاستكثروا من القياس ومهروا فيه فلذلك اهل الرأى ومقدم جماعتهم الذى

استقر المذهب فيه وفي اصحابه ابو حنيفة۔

یعنی ان (متقدمین) میں فقہ دو طریقہ پر منقسم ہو گئی ایک طریقہ اہل الرائے والقیاس کا اور وہ عراق والے ہیں اور ایک طریقہ اہل حدیث کا اور وہ حجاز (مکہ مدینہ) والے ہیں۔ اہل عراق میں حدیث کم تھی جس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اس لئے انہوں نے قیاس سے زیادہ کام لیا اور قیاس (ہی) میں خوب ماہر ہوئے اِنؔ کو اہل الرائے کہا گیا۔ اہل الرائے کی جماعت کے سردار جن میں اور جن کے شاگردوں میں یہ (طریقہ) مذہب قائم ہوا (امام) ابو حنیفہ ہیں۔

(۲) دوسرے گواہ علامہ شہرستانی ہیں جو ملل والنحل جلد ۲ صـ۳۹ میں لکھتے ہیں۔ "ثم المجتهدون محصورون في صنفين الخ۔ یعنی "مجتہدین دو قسم کے ہیں (۱) اصحاب الحدیث (محدثین) وہ اہل حجاز ہیں جو امام مالک (امام شافعی امام احمد بن حنبل اور امام داؤد اصفہانی کے شاگرد ہیں ان کا نام اصحاب الحدیث اس لئے رکھا گیا کہ ان کی ساری توجہ احادیث کے حاصل کرنے اور حدیثوں کے جمع کرنے اور احکام کو نصوص پر مبنی کرنے میں لگی رہتی تھی۔ یہ لوگ جب تک حدیث یا قول صحابی پاتے قیاس جلی وخفی کی طرف متوجہ نہ ہوتے"۔

یہاں یہ امر ناظرین کے پیش نظر ہے کہ ائمہ ثلاثہ مالک۔ شافعی اور احمد ابن حنبل رحمہم اللہ اصحاب الحدیث میں داخل ہیں ان کے سوا باقی کا حال سنیے۔

"اصحاب الرائے وہ اصحاب ابو حنیفہ ہیں اُن کا نام اصحاب الرائے اس لیے رکھا گیا کہ اُن کی ساری توجہ قیاس اور استنباط کی طرف تھی کئی دفعہ قیاس جلی کو خبر احاد (حدیث) پر مقدم کر دیتے تھے"۔

(۳) تیسرے گواہ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۲۲۶ میں فرماتے ہیں۔

"جب محققین اہل حدیث نے فن روایت اور درجات حدیث خوب مکمل کر لیے تو اس کے بعد ان کی توجہ فقہ کی طرف مائل ہوئی...... اس حالت کے بعد ایک دوسرے

زمانہ کی پیدائش ہوئی، انہوں نے اپنے اصحاب (محدثین) کو دیکھا کہ وہ حدیث کی محنتوں سے اور لوگوں کو فارغ کرکے فقاہت کا سامان کرچکے ہیں تو انہوں نے تفقہ میں انہی کے اصول کا لحاظ رکھا۔ اسواسطے ان پچھلے لوگوں نے اور فنون کی جانب اپنا رخ کیا مثلاً ان صحیح حدیثوں کو بالکل ممیز کر دیا جو کبرائے حدیث کے نزدیک متفق علیہ صحیح تھیں ..... اس منصب کے محدثین بخاری، مسلم۔ ابو داؤد۔ عبد بن حمید۔ دارمی۔ ابن ماجہ۔ ابویعلی۔ ترمذی۔ نسائی۔ دارقطنی۔ حاکم۔ بیہقی۔ خطیب۔ دیلمی۔ ابن عبدالبر۔ اور ان کے پایہ کے لوگ ہیں۔"

(۴) چوتھے گواہ مولانا عبدالحی لکھنوی ہیں۔ جو امام الکلام میں حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:-

"مَن نظر بنظر الانصاف وغاص فی بحار الفقه والاصول متجنباً عن الاعتساف یعلم علماً یقیناً ان اکثر المسائل الفرعیة والاصلیة التی اختلف العلماء فیها فمذهب المحدثین فیها اقویٰ من مذهب غیرهم، وانی کلما اسیر فی شعب الاختلاف اجد قول المحدثین فیه قریباً من الانصاف۔ فلله درهم وعلیه شکرهم کیف لا وهم ورثة النبی صلعم حقا و نواب شرعه صدقا حشرنا الله فی زمرتهم وامتنا علی حبهم وسیرتهم۔"

یعنی جس نے انصاف کی نظر سے دیکھا ہے اور فقہ و اصول کے دریا میں غوطہ لگایا ہے اگر اس میں کجروی نہیں ہے تو وہ یقیناً جانتا ہے کہ اکثر ایسے مسائل فرعیہ و اصلیہ جنہیں علماء مختلف ہوئے ہیں محدثین ہی کا مذہب انہیں اوروں کے مذاہب سے قوی تر ہے۔ اور میں جہاں تک اختلافی باتوں کو دیکھتا ہوں محدثین ہی کا قول ان میں ٹھیک پاتا ہوں اللہ ہی کے واسطے ہے خوبی ان کی اور اسی کے ذمے ہے جزا ان کی کیوں نہیں وہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وارث اور شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائب ہیں۔ اللہ میرا حشر ان کے زمرے میں

کرے اور مجھکو اُن کی محبت اور خصلت پر دنیا سے اٹھائے "۔

ان چاروں شہادتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوچکی کہ اصل فقہا محدثین کی جماعت تھی لہٰذا اب کسی کا یہ کہنا کہ محدثین استنباط اور علم فقہ بلکہ ناسخ منسوخ راجح مرجوح سے بھی ناواقف تھے، فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، واقعات تاریخیہ کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ تعصب پر مبنی ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین واللہ یھدی من یشاءُ الیٰ صراط مستقیم۔

ترجمان القرآن۔ غالباً یہ مضمون ہمارے اُس استدراک کے جواب میں لکھا گیا ہے جو ماہ صفر کی اشاعت میں جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کے مضمون "شخصیت پرستی" پر لکھا گیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ فاضل مضمون نگار نے ہمارے استدراک کو پوری طرح پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ محدثین کرام محض ناقل تھے، یا فقہ سے ان کو کوئی لگاؤ نہ تھا، یا یہ کہ صدر اول کے علماء میں اہل الرائے اور اصحاب الحدیث کے نام سے جو گروہ بن گئے تھے ان میں سے صرف اہل الرائے ہی فقہ کے عالم تھے، اور اصحاب الحدیث کے پاس کوئی علم نہ تھا؛ یہ ایسی باتیں ہیں جو صاحب مضمون نے خود ہی اپنے ذہن سے پیدا کرلی ہیں اور خود ہی ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا مقصد دراصل اور ہی کچھ تھا جس کی طرف انہوں نے توجہ نہیں فرمائی۔ ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ جو لوگ آج اتباع حدیث کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو طریق محدثین کا متبع کہتے ہیں؛ وہ دراصل محدثین کی تقلید میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ تقلید کو مٹانے کے لیے اٹھے تھے، مگر ایک طرح کی تقلید کو چھوڑکر خود ہی ایک دوسری طرح کی تقلید میں گرفتار ہوگئے، اور اب مزید بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات کو یہ احساس بھی نہیں رہا ہے کہ اتباع حدیث اور طریق محدثین کے اتباع اور محدثین کی تقلید میں فرق کیا ہے۔ حدیث کا اتباع یہ ہے کہ جو خبر تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے اس کو روایت اور درایت کے اصول پر جانچ کر دیکھو۔ جب یہ اطمینان ہوجائے

کہ وہ صحیح ہے یا اس کی صحت کا ظن غالب ہے تو اس کی پیروی کرو۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اس کے بعد طریق محدثین کا اتباع یہ ہے کہ جس حدیث کی صحت کا تمہیں اطمینان ہو گیا ہے اس سے احکام کا استنباط اُس طریقہ پر کرو جس کو اہل حدیث نے اختیار کیا تھا، اور اس طریقہ سے اجتناب کرو جسے اہل الرائے پسند کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بھی اہل حق کا طریق ہے، اور اگر کسی شخص کا رجحان اس کی طرف ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ اس کا اتباع کرے۔ ہم کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ قابلِ اعتراض جو چیز ہے وہ محدثین کی تقلید ہے۔ اور ان کی تقلید یہ ہے کہ تم روایت اور درایت اور استنباط احکام میں بالکل محدثین پر اعتماد کر لو اور تحقیق صرف اس چیز کا نام رکھ دو کہ کتب حدیث کی چھان بین اور اقوال محدثین کی تلاش و جستجو کی جائے اور جو چیز وہاں جس صورت میں مل جائے اُسی صورت میں اسے لے لیا جائے۔ یہ اگر تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر اصول کے اعتبار سے اس طریقہ اور ائمۂ اربعہ کی تقلید کرنے والوں کے طریقہ میں کیا فرق ہے؟ وہ اپنے ائمہ کی باتیں آنکھ بند کرکے قبول کرتے ہیں، اور تم اپنے ائمہ کی۔ فرق جو کچھ بھی ہے اشخاص کا ہے۔ باقی رہی تقلید شخصی تو وہ دونوں جگہ یکساں ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک روایت کا تعلق ہے اکابر محدثین کی تحقیق سے کوئی شخص بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ اس فن کے ماہر ہیں، اور ہر فن میں اس کے ماہر ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے لیکن روایت کے باب میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل اور درایت اور فہم اور استنباط سے ہے ان میں بھی وہی بالکلیہ معتمد سمجھے جائیں؟ آخر یہ کس بنا پر ضروری ہو گیا کہ مختلف احادیث کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے، اور ان کے اختلافات میں تطبیق کی صورتیں نکالنے، اور ان کو قرآن اور عقل کی کسوٹی پر جانچنے، اور ان سے شارع کا مقصد و منشار معلوم کرنے، اور ان سے کلی یا جزئی احکام مستنبط کرنے میں جن جن راہوں پر ائمۂ حدیث گئے ہیں آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے انہی راہوں پر جائیں اور خود اپنی عقل و فہم اپنی درایت و بصیرت اور اپنی تحقیق و اجتہاد سے کام نہ لیں۔ ان امور میں اگر کوئی شخص محدثین کی تقلید سے انکار کرتا ہے تو آپ اس کو یہ معنی کیوں

پہناتے ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے تفقہ کا منکر ہے اور ان کو محض ناقل سمجھتا ہے اور ان کے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ ناسخ و منسوخ اور راجح و مرجوح کا علم ہی نہ رکھتے تھے؟ کیا ان کے تفقہ کا اعتراف کرنے کی بس یہی ایک صورت ہے کہ تفقہ کو اپنے اوپر حرام کرکے صرف انہی کے لئے مختص کر دیا جائے، اور یہ طے کر لیا جائے کہ احادیث میں بعض کو قبول اور بعض کو رد کر دینا، بعض کو ناسخ اور بعض کو منسوخ ٹھیرانا، بعض کو راجح اور بعض کو مرجوح قرار دینا صرف انہی کا کام تھا؟

فاضل مضمون نگار نے جو شواہد پیش فرمائے ہیں ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ حدیث صاحب اجتہاد بھی تھے اور بعض بزرگوں کی رائے میں ان کا طریق اجتہاد اصحاب الرائے یعنی اصحاب ابی حنیفہ کے طریق اجتہاد سے بہتر تھا۔ ان دونوں باتوں میں سے آخری بات کا تعلق تو اپنی اپنی رائے سے ہے۔ دونوں طریقے برحق ہیں۔ جس شخص کا میلان جس طریقہ کی طرف ہو، وہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اس باب میں ایک گروہ کا قول دوسرے گروہ پر حجت نہیں ہو سکتا۔ رہی پہلی بات تو ہم نے اس سے انکار ہی کب کیا تھا۔ ہمارا مدعا تو صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ائمہ متقدمین دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک طرف وہ حضرات تھے جن کا خاص موضوع بحث اخبار و آثار کی چھان بین کرنا تھا۔ اور دوسری طرف وہ تھے جن کا اصل کام روایات کے ذخیرہ سے مدد لے کر اسلامی قوانین مدون کرنا تھا۔ پہلے گروہ پر اخباری نقطۂ نظر زیادہ غالب تھا اسلئے وہ زیادہ تر اسناد کے تسلسل اور رواۃ کی عدالت پر حدیث کی صحت و قوت کا مدار رکھتے تھے اور اس اعتبار سے جو حدیث ان کو قوی نظر آتی تھی اُسی سے احتجاج کرتے تھے بخلاف اس کے دوسرے گروہ پر قانونی نقطۂ نظر کا غلبہ تھا۔ انہوں نے قرآن اور سنت کے وسیع و غائر مطالعہ سے اسلام کی روح اور اس کے مزاج اور اس کے اصول کلیہ جیسے کچھ سمجھے تھے انہی کے معیار پر وہ روایات کو پرکھتے تھے، اور اسی بصیرت کی بنا پر وہ بسا اوقات ایسی روایات کو قبول کر لیتے تھے جو محدثین کی نگاہ میں ضعیف ہوتی تھیں اور ایسی روایات کو چھوڑ دیتے تھے جو ان کی نگاہ میں قوی ہوتی تھیں۔ احادیث کے رد و قبول میں یہ اختلاف

جو علماء حدیث اور علماء فقہ کے درمیان پایا جاتا ہے، اس کی وجہ ہر صاحب فہم خود سمجھ سکتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو سمجھانے کے لئے دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت ہو لیکن ان دونوں گروہوں کا ایک ایک فن میں ماہر خصوصی ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ جو اہل الحدیث تھے وہ فقہ سے بے بہرہ تھے، اور جو فقیہ تھے وہ حدیث سے کورے تھے۔ اگر کوئی شخص میلان و رجحان کے یہ معنی سمجھتا ہے تو یہ اس کی سمجھ کا قصور ہے۔

اقتباسات
مسلمان غیروں کی نگاہ میں

[پچھلے دنوں شاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے موقع پر لنڈن میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا سالانہ اجتماع ہوا تھا جس میں سوسائٹی کے مبلغین نے دنیا کے مختلف حصوں کے متعلق اپنے اپنے مشاہدات و تجربات بیان کئے تھے۔ اس سلسلہ میں ریورینڈ اے۔ ایچ۔ ولکنس نے ٹرکی، شام، فلسطین، عراق اور ایران کے متعلق جو کچھ کہا وہ ہمارے لیے خاص طور پر سبق آموز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ریورینڈ ولکنس کے تمام بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ بلاشبہ ان میں بعض باتیں مبالغہ آمیز بھی ہیں، مگر ہم جس غرض کے لیے ان کی تقریر یہاں نقل کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دشمنوں کی نگاہ سے اپنے آپ کو دیکھیں اور یہ معلوم کریں کہ ہماری کونسی کمزوریاں ہیں جن سے ہمارے دشمن فائدہ اٹھانے کی توقع رکھتے ہیں اور کون کون سے حربے ہیں جو ہمارے شیرازہ کو توڑنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں]

ریورینڈ ولکنس نے صدر، لارڈ سینکے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا:۔

گذشتہ سال کے اختتام پر میں نے جنوبی شرقی یورپ سے لیکر ایران تک تمام شرق قریب کا دورہ کیا۔ میں اس صحبت میں جو کچھ بیان کرنے والا ہوں وہ یورپین علاقہ اور مصر کے متعلق نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس وسیع علاقہ کے متعلق ہے جس میں ٹرکی، شام، فلسطین، عراق، اور ایران شامل ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہی علاقہ اسلام کا قلب ہے۔ اس علاقہ کے متصل ہی جنوب میں وہ ملک واقع ہے جہاں سے یہ مذہب اٹھا تھا۔ ہر اعتبار سے یہ علاقہ دین محمدی کا فطری وطن کہا جا سکتا ہے، اور اس قلب کی ہر حرکت مختلف

راستوں سے دنیائے اسلام کے بعید ترین گوشوں تک کی نبضوں میں جنبش پیدا کر دیتی ہے۔ بحر الکاہل کے جزائر اور جاوا، وسط افریقہ کے دور دراز علاقے اور الجزائر و مراکش سب اس مرکز کے ساتھ مربوط ہیں۔ لہٰذا یہ نامناسب نہ ہوگا کہ آج کی صحبت میں ہم تھوڑا سا وقت اس قلب کی حالت کا جائزہ لینے میں صرف کریں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے میں نہیں سمجھتا کہ یہ دل آج بھی اتنا ہی صحیح و سالم اور مضبوط ہوگا، جتنا اب سے پہلے، ربع صدی پہلے تک تھا، کیونکہ غیر متبدل مشرق میں بھی اب بڑے بڑے تغیرات رونما ہو رہے ہیں اور یورپ کے ہیجانات ہر طریقے سے ان علاقوں کی زندگی میں حرکت پیدا کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کراؤنگا کہ اس علاقہ میں تین بڑی بڑی قومیں آباد ہیں۔ ترک۔ ایرانی۔ اور عرب۔ یہ تین مختلف نسلوں کے لوگ ہیں جن پر نئی قوتوں کے اثرات ایک ہی رنگ میں پڑ رہے ہیں، اگرچہ کمیت کے اعتبار سے ان میں فرق ضرور ہے۔ ایرانی کبھی فطری مسلمان نہیں رہا ہے۔ وہ ایک خوش باش لذت پسند انسان ہوتا ہے۔ اسے اپنی شراب سے عشق ہے اور محمدؐ نے اسے حرام کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آرٹ کا شیدائی ہے (مگر اسلام کی بندشوں کے سبب سے) وہ مجبور ہے کہ اپنے اس ذوق اور اپنی اس رنگ آفرینی کا اظہار بس اپنی قالینوں کے نقوش میں کیا کرے۔ اس کی یہ قالینیں بہترین کاریگری کا نمونہ پیش کرتی ہیں، مگر وہ دراصل اس بات کی علامت ہیں کہ ان کی پشت پر ایرانی آرٹ کے کس قدر زیادہ وسیع امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ فطرۃً شاعر بھی ہے، مگر اس کی شعریت پر بہت سی بندشیں لگا دی گئی ہیں، اور جب سے محمدؐ کا تسلط اس کی سرزمین پر ہوا ہے، وہ کوئی چیز زیادہ قابل قدر پیدا نہیں کر سکا (؟)۔ غرض ایران کی زمین میں اسلام فطرۃً نامانوس ہے۔ اب رہے ترک، تو لوگ کہتے ہیں کہ مذہبیت انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور خود میرے نزدیک بھی یہ کہنا درست ہے کہ آج تک دنیا میں کوئی قبیلہ ایسا نہیں پایا گیا جس میں مذہب کا کوئی اثر نہ ہو، مگر جن کثیر التعداد قوموں سے مجھے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے (میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ واقفیت زیادہ تر سطحی ہے) ان میں ترک مجھ کو خصوصیت

کے ساتھ لامذہب نظر آیا۔ اس کے لیے مذہب محض ایک اوپری غلاف ہے۔ اس نے اسلام کو ایک سیاسی سہولت کے طور پر قبول کیا تھا۔ اور اب کہ اسلام کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی، اس نے اس غلاف کو اتار پھینکا ہے۔ تیسری قوم یعنی عرب ان دونوں سے مختلف ہے۔ وہ محمد کا خون اور گوشت ہے۔ اسلام اسی کے صحراؤں کا وطن پرورده تو ہے۔

مگر ان تینوں قوموں یا نسلوں میں اب بڑے تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اب ان کو ایک دوسری قسم کی عصبیت مل گئی ہے، اور وہ قومی عصبیت ہے جس کا دنیا کے اکثر و بیشتر علاقوں میں بول بالا ہو رہا ہے۔ ٹرکی میں ایک مطلق العنان لیڈر کے ماتحت ملک نے ایک ایسی وحدت حاصل کر لی ہے جو صدیوں سے اس کو نصیب نہ تھی۔ وہ حب وطن کے تازہ نشہ میں سرشار ہے۔ ایک جدید سیاسی اور تجارتی وجود کی حیثیت سے اس کی تنظیم ہو رہی ہے اور باشندگان ملک کا تمام جوش و خروش اسی راہ میں صرف ہو رہا ہے۔ کمال اتاترک ایک سخت لامذہب آدمی ہے، اور اس نے اپنی قوم والوں کے لیے پیغمبر کے اتباع کو کوئی آسان کام نہیں رہنے دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ آزادی ایک ایسی چیز ہے جس کی تعبیر مختلف قومیں مختلف طور پر کرتی ہیں۔ میں نے جو کچھ استانبول میں دیکھا اور جو کچھ وہاں رہ کر سنا اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا ہے کہ اسلام اب ترکی قوم کی زندگی میں کوئی قوت عاملہ نہیں رہا ہے۔

ایران کو دیکھیے تو یہاں کی داستان بھی وہی ہے، اگرچہ بالکل ویسی ہی نہیں ہے۔ یہاں بھی ایک مطلق العنان بادشاہ ہے۔ جس نے باشندوں کو نئے سیاسی داعیات اور نئی امیدوں سے بھر دیا ہے۔ پرانے مذہبی جذبات کی جگہ نئے جذبہ حب وطن نے لے لی ہے، اور لوگوں کی توجہات تمام تر اپنے شہروں کی تعمیر جدید، سڑکوں اور ریلوے لائنوں کی تیاری، کارخانوں کے قیام، تیل کے چشموں کی برآمد، فوج کی تنظیم و توسیع، ہوائی قوت کے اضافہ، ایک بحری بیڑے کی تعمیر، اور تعلیم عمومی کی اشاعت میں لگی،

ہوئی ہیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو ایران جدید کے دماغ میں بھری ہوئی ہیں، اور ان کے ساتھ اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

جب ہم عراق اور شام کے عرب کی طرف توجہ کرتے ہیں (اور میرا خیال ہے کہ بڑی حد تک فلسطین اور شرق اردن بھی اس کے شریک حال ہیں)، تو وہاں بھی ہم کو یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں نے ان عرب ریاستوں میں سے ایک ریاست کے ایک بڑے عہدہ دار سے دریافت کیا کہ آیا اس کا کوئی امکان ہے کہ کسی وقت تمام اسلامی ریاستیں متحد ہو کر عیسائیوں کا سر کچلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں؟ یہ عہدہ دار نہایت لائق اور مدبر آدمی ہے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ "نہیں۔ اس کا تو قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر علاقہ کے عرب خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی باہم متحد ہو کر غیر عرب اقلیتوں کو کچل ڈالیں گے۔ عام اس سے کہ وہ ارمنی ہوں یا آشوری، یا یونانی یا مسلمان"۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال ہے۔ عرب مسلمان عرب عیسائیوں کے ساتھ غیر عرب مسلمان کے مقابلہ میں متحد ہو رہے ہیں ا ربع صدی پہلے تک اس قسم کی کسی چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ قوم پرستی کا جن جو اکثر ملکوں پر آج کل مسلط نظر آتا ہے، نوجوان عربوں کے دماغ پر بھی چڑھا ہوا ہے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسکے معنی کیا ہیں؟ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان اسلامی ممالک پر سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ ایک نئی آتش فشاں قوت ٹھوس چٹان میں سے راستہ پیدا کر رہی ہے، اور پرانی سوتیں خشک ہو رہی ہیں۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ مسیحی قوتیں کونسی ہیں۔ ایک تغیر کے معنی ایک نئے موقع کے ہیں۔ پہلی قوت تو وہ ہے جو پرانے مسیحی کلیساؤں کی شکل میں دوسری تیسری صدی عیسوی سے وہاں موجود ہے یعنی ارمنی کلیسا، آشوری کلیسا۔ اور یونانی کلیسا۔ ان کے بہت ہی حقیر باقیات اب وہاں رہ گئے ہیں جن کی حیثیت اسلامی سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی سی ہے۔ ترکوں اور عربوں کے ساتھ اب تک

ان کا حال یہ رہا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو اپنے مذہب میں شامل نہیں کر سکتے تھے، اور اگر کسی نے کیا بھی تو وہ چنداں قابل التفات نہ تھا۔ مگر اب ایک تغیر شروع ہو گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کلیساؤں میں ایک نئی روشنی داخل ہو رہی ہے۔ انہوں نے بائبل پڑھنی شروع کر دی ہے۔ وہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کے بہت شکر گذار ہیں کہ اس نے ان کی کتب مقدسہ کو جدید شکل میں شائع کیا ہے۔ جب اہل کلیسا اور عام عیسائی بائبل پڑھنے لگیں تو ان میں روحانی زندگی پیدا ہونے کی امید کیجا سکتی ہے۔

دوسری چیز مسیحی مبلغین کی قوت ہے۔ یہ کارکنوں کی کوئی بڑی جماعت تو نہیں ہے، مگر جری اور بہادر جماعت ہے۔ اگر آپ مردم شماری کو معیار قرار دیں گے تو بلا شبہ آپ کہدیں گے کہ انہوں نے کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ مدتوں سے تخم ریزی میں لگے ہوئے ہیں اور بڑی سخت زمین میں تخم ریزی کرنے کا صبر آزما کام ان کے حصہ میں آیا ہے۔

ایک اور قوت وہ ہے جو ہمارے آج کے اجتماع کی شکل میں یہاں موجود ہے، یعنی بائبل کی قوت۔ بائبل ایک غیر جسمانی وجود ہے۔ تم اٹھ کر اسے پکڑ نہیں سکتے۔ تم اس کا سر نہیں توڑ سکتے جس طرح ایک مبلغ کا سر توڑ سکتے ہو۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جو غیر محسوس طور پر خاموشی کے ساتھ اندر سرایت کر جاتی ہے اور ایسے ایسے طریقوں سے اپنا کام کرتی ہے جن کا آپ پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک مثال ایک بڑے عہدہ دار کے ذریعہ سے میرے علم میں آئی۔ یہ عہدہ دار مسلمان ہے اور غیر عرب مسلم اقلیتوں میں سے ایک کا لیڈر رہے۔ اس کی قوم نے حال ہی میں تعلیم پانی شروع کی ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ بالکل جاہل تھے۔ ان کے پاس کتابیں نہیں تھیں۔ اب جو انہوں نے تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اس کی وجہ سے ان میں لٹریچر کی مانگ پیدا ہوئی تو اس مسلمان لیڈر نے ان کو ایک کتاب دی تاکہ اس کا مطالعہ کریں۔ آپ کیا اندازہ کرتے ہیں کہ وہ کونسی کتاب ہوگی؟ وہ متی کی انجیل تھی جو ایک مسلمان لیڈر نے اپنی مسلمان قوم کو پڑھنے کے لیے دی!

ایک اور بات ہے جس کا ذکر، تقریر ختم کرنے سے پہلے، میں کر دینا چاہتا ہوں، اور وہ کتب مقدسہ کی تخلیقی قوت ہے۔ ایک مشنری پادری کہتا ہے کہ "آج کل تبلیغی حملہ کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی کے سفیر ہیں۔ اسلامی ممالک میں علانیہ تبلیغ تو ہم کو کرنے نہیں دی جاتی اور اس میں ہر طرح مزاحمت کی جاتی ہے۔ مگر ایک کتب فروش کی حیثیت سے ہم وہاں کام کر سکتے ہیں۔ عیسائی مشنری تو وہاں خال خال ہیں۔ مگر ہمارے کتب فروش ایجنٹ ہر جگہ پہنچتے ہیں، دور دراز مقامات پر مقدس کتابیں لیئے ہوئے پھرتے رہتے ہیں، اور اپنی تلقین سے، تعلیم سے، کتب فروشی سے ہر جگہ چھوٹے چھوٹے چرچ وجود میں لا رہے ہیں۔

(پادری دلکنسن کی اس تقریر کے ساتھ اگر ہمارے برادران دینی ایک نظر برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ پر بھی ڈال لیں تو مناسب ہے۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں اس نے دنیا کی چھ زبانوں میں بائیبل کے ترجمے کئے ہیں، اور اب ان زبانوں کی تعداد ۷۱۱ تک پہنچ گئی ہے جن میں بائیبل کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک سال کے اندر جو نسخے تمام دنیا میں فروخت کئے گئے ہیں ان کی تعداد ۱۱۳۴۳۹۴۸ ہے۔ یورپ میں بائیبل کی اشاعت گھٹ رہی ہے، ایشیا و افریقہ میں روز افزوں ہے۔ مغربی یورپ میں گذشتہ سال کی بہ نسبت اس سال پونے تین لاکھ نسخے کم فروخت ہوئے۔ اور ایشیا میں ۱۳ لاکھ ۶۳ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ایران اور عراق میں ۶۵ ہزار، شام میں ۵۶ ہزار، شمالی افریقہ میں ۶۴ ہزار، ہندوستان میں تقریباً ۱۲ لاکھ اور چین میں تقریباً ۴۶ لاکھ نسخے فروخت ہوئے۔ یہ فروغ جو بائیبل سوسائٹی کے کام کو نصیب ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوم جس کو آپ لا مذہب سمجھتے ہیں، پونے چار لاکھ پونڈ اپنی دینی کتاب کی اشاعت کے لیے صرف ایک سال میں صرف کر سکتی ہے۔)

رسائل و مسائل

سات زمینیں اور انکی آبادیاں

ایک صاحب لاہور سے لکھتے ہیں :۔

" براہ کرم مندرجہ ذیل علمی استفسارات پر اپنی مفصل تحقیق شائع فرما کر ممنون فرمائیے۔

۱۔ روایت سبع ارضین فی کل ارض نبی کنبیکم و آدم کآدمکم و نوح کنوحکم وابراھیم کابراھیمکم و عیسیٰ کعیسیٰ میں سبع ارضین سے کیا مراد ہے۔ اور ان ساتوں زمینوں میں زمین وار نبی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ نیز ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمائیے کہ آیا یہ ساتوں زمینیں اسی کرہ ارض پر واقع ہیں یا کیا؟ اور انبیاء متذکرہ بالا کے مثل آیا پیدا ہو چکے ہیں یا آگے چل کر پیدا ہونگے۔

۲۔ بروایت تمیم داری ترمذی میں ہے فقال اخبرونی عن عین زغر ابس روایت میں کونسا چشمہ مراد ہے۔ مروجہ اٹلس میں ہم اسے کہاں سمجھیں "

ترجمان القرآن۔ سوال اول میں جس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے اس کے مضمون کا ایک حصہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ سورۂ طلاق کے دوسرے رکوع میں ہے :۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ — وہ اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیے سات آسمان اور انہی کے مثل زمین کی قسم سے۔

اسی آیت کی تشریح حدیث میں کی گئی ہے کہ سات زمینیں اور ہیں جن میں سے ہر ایک میں تمہارے آدم جیسا ایک ایک آدم اور تمہارے نبی جیسا ایک ایک نبی ہے۔ ابن جریر نے یہ حدیث

شعبہ عن عمرو بن مرہ عن ابی الضحیٰ عن ابن عباس کے طریق سے روایت کی ہے اور اس میں مختصراً صرف اتنا ہے کہ فی کل ارض مثل ابراھیم ونحو ما علی الارض من الخلق ۔ حاکم اور بیہقی نے اس کو عطاء بن السائب عن ابی الضحیٰ کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ :۔

فی کل ارض آدم کآدمکم ونوح کنوحکم وابراھیم کابراھیمکم وعیسیٰ کعیسیٰ ونبی کنبیکم۔

ان میں سے ہر زمین میں ایک آدم ہے تمہارے آدم کی طرح اور ایک نوح ہے تمہارے نوح کی طرح اور ایک ابراہیم ہے تمہارے ابراہیم کے مانند اور ایک عیسیٰ ہے عیسیٰ کے مانند اور ایک نبی ہے تمہارے نبی کے مانند۔

ان دونوں روایتوں کی اسناد صحیح ہے اور رواۃ ثقہ ہیں۔ قرآن سے بھی ان کا مضمون مختلف نہیں۔ اور کوئی بات عقل کے بھی خلاف نہیں۔ مدعا صاف طور پر یہ ہے کہ جس طرح تمہارے اس کرۂ ارض پر آبادی ہے اسی طرح دوسرے کروں میں بھی آبادیاں ہیں اور وہاں بھی اسی طرح انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری ہے اور جس شان کے نبی تمہارے ہاں آئے ہیں ویسے ہی ان کے ہاں بھی آئے ہیں۔ اس میں شبہ کا محل اگر کوئی لفظ ہے تو وہ لفظ ارض ہے۔ ارض کا اطلاق کرۂ زمین پر ہوتا ہے، اس سے لوگوں کو خیال ہوا کہ سات زمینوں سے مراد شائد زمین کے سات طبقات ہیں لیکن یہاں ارض کا لفظ اس خاص کرۂ خاکی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ جائے قرار ہونے میں زمین کے مشابہ ہونے کی حیثیت سے دوسرے کروں کو بھی ارض کہدیا گیا ہے۔ اور اس میں ایک بڑی مصلحت ہے۔ یہ بات اس زمانہ میں فرمائی گئی تھی جب کہ مریخ و عطارد اور دوسرے کروں میں آبادی کا امکان سمجھنے کے لیے انسان کو ۱۳ صدیاں درکار تھیں۔ اس وقت کا انسان اس چیز کو اتنا ہی مستبعد بلکہ ناممکن سمجھتا تھا جتنا آج کل کا انسان معجزات انبیاء کو ناممکن سمجھتا ہے۔ اگر اس وقت یہ کہا جاتا کہ آسمان

ہیں یہ باریک سے چمکتے ہوئے تارے جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ دراصل تمہاری زمین سے بھی بڑے کرے ہیں اور ان میں زمین ہی کی طرح آبادیاں ہیں تو لوگ اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوتے اور نبی کے متعلق کہتے کہ یہ تو بالکل خلاف عقل باتیں کہتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح آج کل کے لوگوں سے جنت اور دوزخ اور میزان اور صراط کی باتیں کہی جاتی ہیں تو وہ ان کو خلاف عقل قرار دیتے ہیں۔ پس لوگوں کی جہالت اور ان کی ادنی استعداد عقلی کا لحاظ کر کے حقیقت کو ایک ذرا سے استعارہ کے پردے میں بیان کیا گیا تاکہ ان کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت نہ ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی مصلحت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ ومن الارض مثلھن کی تفسیر کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ لو حدثتکم تفسیر ھذہ الآیۃ لکفرتم وکفرکم تکذیبکم بھا "اگر میں تم سے اس آیت کی تفسیر بیان کردوں تو تم کافر ہو جاؤ گے۔ اور تمہارا کفر یہ ہوگا کہ تم آیت ہی کو جھٹلانے لگو گے" (رواہ مجاہد وسعید بن جبیر عن ابن عباس)۔

دوسری روایت جس کے متعلق سائل نے دریافت فرمایا ہے اس کا حوالہ انہوں نے نہیں دیا کہ ترمذی میں کس مقام پر ہے۔ راقم الحروف حافظ حدیث نہیں ہے، اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہے کہ کتب حدیث کی ورق گردانی کر سکے۔ جو لوگ سوال کی زحمت گوارا فرماتے ہیں وہ اتنی عنایت اور کیا کریں کہ حدیث کا پورا حوالہ دے دیں۔

ایک تنبیہ

ہمارے ایک نہایت محترم بزرگ اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شخصیت پرستی پر آپ کا استدراک بہت خوب ہے۔ ہر پہلو سے قابل داد۔ البتہ اس کے ص ۱۱۰ و ص ۱۱۱ کو ایک بار پھر پڑھ لیجیے بعض جذبات کے تحت میں جو مثالیں درج کی گئی

ہیں ان سے ہم جیسے نفس پرست بہت کچھ ناجائز فائدہ اٹھالیں گے۔ پہلی چیز "کذب" اور "کذاب" کے معنی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ لفظ بطور گالی کے مستعمل ہوتے ہیں اور پڑھنے والا یہی سمجھے گا۔ حالانکہ عربی میں اس کا ایک محل صرف "خلاف تحقیق"، "غیر مطابق واقعہ" "تحقیق ناصواب" کا ہے۔ نخعی، حضرت ابن عمر وغیرہ کے اقوال میں میرے نزدیک صرف یہی معنی ہیں۔ وہ دوسروں کو اردو کے محاورہ میں "جھوٹا" نہیں کہہ رہے ہیں، بلکہ محض ان کی تحقیق کو غیر صائب بتا رہے ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے اعمش کے متعلق جو کچھ فرمایا اس کا بھی جو مطلب اردو عبارت سے ظاہر ہو رہا ہے وہ امام پر زیادتی ہے۔ وہ غصہ میں اگر یہ نہیں فرما رہے کہ اعمش تو اس درجہ کا فاسق تھا کہ نہ کبھی روزہ رکھا، نہ غسل جنابت کیا بلکہ محض مسئلہ الماء من الماء کی غلطی کی اہمیت ظاہر کرنے کو تاسف کے لہجہ میں فرما رہے ہیں کہ اگر اس مسئلہ پر عمل ہوا تو روزہ اور غسل عمر بھر بھی ادا کیسے جائیں، اکارت رہیں گے۔

آپکا جو اصل پائنٹ ہے وہ ان مثالوں کے بغیر بھی بالکل صاف و واضح رہتا ہے پھر خواہ مخواہ ایک نئے فتنہ کے احتمال کو بھی کیوں گوارا کیا جائے"۔

تنبیہ ہمارے اس مضمون کے متعلق ہے جو صفر ۵۶ھ کے پرچہ میں "استدراک" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا ہم دلی شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ در اصل کوئی انسان خطا اور لغزش سے پاک نہیں ہے غلطی جس طرح دوسروں سے ہو سکتی ہے ہم سے بھی ہو سکتی ہے اور دیانت کا اقتضاء یہ ہے کہ جب ہم کو کسی لغزش پر تنبیہ کیا جائے تو فوراً اپنی اصلاح کر لیں۔ حقائق کی تنقیح اور علم کی ترقی بغیر اس کے ممکن ہی نہیں کہ اہل علم ایک دوسرے کے کاموں پر تنقید کرتے رہیں، اور جن لوگوں پر تنقید کی جائے وہ علامیت کا پندار چھوڑ کر ایک طالب علم کی طرح استفادہ کی کوشش کریں۔ ہم نے ائمہ حدیث و فقہ کی باہمی چشمکوں کا

ذکر صرف اس غرض کے لیے کیا تھا کہ جو لوگ جرح و تعدیل کے علم کو بالکل یقینی سمجھتے ہیں ان کی غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اس قسم کی مثالوں سے استدلال کر کے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ بالکل ہی ناقابل اعتبار رہے، اور اس میں محدثین کرام نے رواۃ حدیث کے متعلق جتنی رائیں ظاہر کی ہیں وہ سب کی سب نفسانیت پر مبنی ہیں، تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔ انصاف یہ ہے کہ محدثین نے انتہا درجہ کی نیک نیتی اور غایت درجہ کی محققانہ صاف نظری کے ساتھ رجال حدیث پر تنقید کی ہے اور اشخاص کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش جو ایک انسان کر سکتا ہے اس میں کوئی کسر انہوں نے اٹھا نہیں رکھی ہے لیکن جو بات انسان کی قدرت سے باہر ہے اس کی ان سے امید رکھنا غلطی ہے جن امور غیب تک انسان کا علم پہنچ ہی نہیں سکتا ان تک وہ کیسے پہنچ جاتے؟ اور جن کمزوریوں سے بشری علوم کا خالی ہونا ممکن ہی نہیں ہے آخر ان کا علم ان سے کیونکر خالی ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص جرح و تعدیل کے علم پر بالکل ہی اعتماد کرے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ رجال کے عدل، ضبط، حفظ اور ثقاہت وغیرہ کے متعلق جو رائیں ائمہ حدیث نے قائم کی ہیں وہ سب کی سب قطعی صحیح ہیں، تو یہ بھی ایک دوسری قسم زیادتی ہو گی۔ عدل کا طریق ان دونوں انتہاؤں کے وسط میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جو حدیث تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے اس کو روایت اور درایت دونوں کے معیار پر جانچ کر دیکھو۔ محدثین کی تحقیق سے بھی مدد لو، قرآن کے محکمات اور سنت کے متواترات و مشہورات پر بھی نظر رکھو، ائمہ مجتہدین کی آراء سے بھی استفادہ کرو۔ اور پھر خدا نے جو عقل اور سمجھ بوجھ تم کو عطا کی ہے اور آفاق و انفس کے متعلق جن معلومات سے تم کو بہرہ ور کیا ہے ان سے بھی کام لو۔ پچھلے علماء بھی یہی کرتے رہے ہیں اور اس زمانہ کے علماء کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ نبی کے سوا کسی زمانہ کے انسانوں کی تحقیق دوسرے زمانہ کے انسانوں کو تحقیق سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔

ایک شافعی مسلمان کی شکایت

بھٹکل سے ہمارے ایک شافعی بھائی لکھتے ہیں :۔

"ترجمان القرآن کو ہزارہا شافعی مسلمان ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور آپ کی مجتہدانہ رایوں کی دل سے قدر کرتے ہیں اور آپ کو بے تعصب سمجھتے رہے ہیں مگر افسوس کہ خیال سراب ثابت ہوا۔ محرم ۵۶ھ کے رسالہ کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حنفی حضرات بحیثیت مجموعی چاہے جتنے بے تعصب نظر آئیں، مگر جب کوئی تذکرہ مقابلۃً کریں گے تو ساری رواداری کو طاق نسیان کی نذر کر کے اپنے اصلی خط و خال میں ظاہر ہوجائیں گے۔ اس صورت حال کی آپ کے بلند بانگ دعووں کی موجودگی میں بہت کم امید تھی محرم ۵۶ھ کے پرچہ میں "دیہات میں نماز جمعہ" والا مضمون پڑھا تو حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ آپ کو حضرت امام شافعی و دیگر ائمہ کے اسماء مقدسہ کے سامنے کوئی تعظیمی جملہ تحریر کردینے میں بھی تامل ہے (ملاحظہ ہو ص ۷)۔ حالانکہ آپ حضرت امام اعظم رح کے اسم پاک اور ان کے شاگردوں کے مقدس ناموں کے آگے غیر ارادی طور پر رضی اللہ عنہ اور رضی اللہ عنہم کے تعظیمی کلمات کا دھڑلے سے اضافہ کرتے جاتے ہیں"۔

جواباً عرض ہے کہ یہ خاکسار اگرچہ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے طریقہ کا تبع ضرور ہے، مگر تمام ائمہ سلف کو یکساں احترام کا مستحق سمجھتا ہے، اور کسی کو کسی کے مقابلہ میں بڑھانے یا گھٹانے کا خیال بھی کبھی اس کے دل میں نہیں آیا ہے رہے تعظیمی کلمات تو سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نام کے ساتھ ان کے التزام کا اہتمام میں نے نہیں کیا۔ بارہا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نام بھی بغیر ان تعظیمی کلمات کے اس قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس تساہل کو آپ میرا قصور کہہ سکتے ہیں، مگر یہ قصور عام ہے، کسی کے ساتھ خاص نہیں۔ اور یہ کلیہ قائم کرلینا بھی درست نہیں کہ ان کلمات کے بغیر کسی بزرگ کا نام لینا دراصل لکھنے والے یا بولنے والے

کے دل میں احترام نہ ہونے کی دلیل ہے۔

اس خط کا جواب ڈاک سے دیا جاسکتا تھا، مگر آج ہم کو اُن تمام شکایت ناموں کا ایک جامع جواب دینا ہے جو اس رسالہ کی چار سالہ زندگی کے دوران میں ہمارے نام آئے ہیں، اور جن کا جواب ہم نے ہمیشہ سکوت سے دیا ہے، اسی لیے اس خط کو شائع کرکے اس کا جواب دیا جارہا ہے۔ ہمارے پاس اکثر اس قسم کے خطوط آتے رہتے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی شکایتیں کی جاتی ہیں۔ کوئی صاحب اس بات پر ناراض ہوتے ہیں کہ فلاں شخص (زندہ یا مردہ) کے مضامین رسالہ میں کیوں شائع کیے جاتے ہیں۔ کسی کی محض اس بات پر دل آزاری ہوجاتی ہے کہ فلاں شخص (مثلاً ابن القیم) کے لئے رحمۃ اللہ کیوں لکھا گیا۔ کوئی صاحب حکم لگاتے ہیں کہ تم وہابی ہوگئے ہو کیونکہ فلاں مسئلہ میں تم نے حضرات اہل طریقت سے اختلاف کیا۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ تم متعصب حنفی ہو کیونکہ فلاں مسئلہ میں تم نے حضرات اہل حدیث سے اختلاف کیا۔ ایک صاحب کی رائے میں ہم آزاد خیالی کے مجرم ہیں اور دوسرے صاحب کی رائے میں ہم پر قدامت پرستی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ غرض جس کو اپنے مسلک اور اپنے خیالات کے خلاف کوئی چیز نظر آتی ہے وہ ایک عتاب نامہ ہمارے نام لکھ دیتا ہے۔ ہم ان حضرات سے عرض کرتے ہیں کہ آخر آپ لوگ اس قدر ذکی الحس کیوں ہوگئے ہیں کہ ذرا ذرا سی باتوں پر آپ کے جذبات کو ٹھیس لگ جاتی ہے؟ اور یہ تنگ دلی کیسی ہے کہ اپنی رائے کے خلاف کسی بات کے سننے کا تحمل بھی آپ میں نہیں؟ ہم نہیں کہتے کہ آپ ہماری بات پر آمنّا وصدّقنا ہی کہا کریں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی حق ہے اور اس کو مان لینا سب پر فرض ہے۔ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں، اور آپ حق پر ہوں۔ اگر آپ ہمیں کسی مسئلے میں غلطی کرتے دیکھیں تو آپ کو حق ہے کہ ہمیں ٹوک دیں، اور راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ کام شکایت اور اظہار غیظ وغضب سے نہیں ہوسکتا۔ ذرا صبر وتحمل اپنے اندر پیدا کیجیے۔ آپ کی رائے کے خلاف جو شخص کچھ کہتا ہے اس کو ٹھنڈے دل سے سنیے اور انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ اگر اس کی بات معقول ہو اور حق کے مطابق نظر آئے تو تعصب

اس بنا پر اس کو رد نہ کر دیجیے کہ پہلے سے جن خیالات پر آپ جمے ہوئے ہیں ان سے آپ کو محبت ہو گئی ہے اور اگر اسے آپ خلافِ حق سمجھیں تو دلیل و حجت سے اس کے قائل کو سیدھا راستہ دکھائیے۔ ہم نے ان صفحات کو کبھی ان لوگوں کے لیے بند نہیں کیا جو ہماری رائے سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ یہاں تو سخت ملحدوں اور دہریوں اور غیر مذاہب والوں کے لیے بھی جگہ موجود ہے۔ اگر ہم مخالفین کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے تو البتہ شکایت جائز ہوتی۔ مگر جب کہ ہر اختلاف کرنے والے کے لیے یہاں بحث و استدلال کا موقع ہے تو کیا وجہ ہے کہ آپ احقاقِ حق کی کوشش نہیں کرتے، اور اپنی قوتِ تحریر کو عتاب نامے لکھنے میں ضائع کرتے ہیں؟

خریداران قاسم العلوم کی خدمت میں ضروری اطلاع "قاسم العلوم" کے بجائے

سلطان العلوم

رسالہ قاسم العلوم کی اشاعت کے التوا سے جہاں احقر کو حد درجہ رنج و ملال تھا، خریداران قاسم العلوم کے آئے ہوئے خطوط سے ان کی رسالہ سے دلچسپی اور ان کے دلی اندوہ و ملال کا احساس ہوا۔

لیکن جن مجبور کن حالات کے ماتحت رسالہ کی اشاعت روک دی گئی ان کا صحیح علم خدائے علیم و قدیر کو ہی ہے تاہم اپنے تبلیغی و مذہبی جذبات اور احباب کرام کے متواتر اصرار سے مجبور ہو کر جدید و مستحکم انتظامات کے ساتھ پھر رسالہ جاری کرنے کا عزم کر لیا گیا ہے لیکن چند اسباب و حالات اور بعض قانونی موانع و مصالح کی بنا پر قاسم العلوم کا اجرا "سلطان العلوم" کے نام سے کرنا پڑ رہا ہے اور اسی نام سے جدید ڈکلریشن داخل کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ رسالہ سلطان العلوم اپنے جدید انتظامات کے ماتحت قاسم العلوم کا نہ صرف نعم البدل ہوگا بلکہ اس کا دور ثانی دورِ اول سے زیادہ شاندار اور کامیاب ثابت ہوگا۔ رسالہ عنقریب سرکاری منظوری اور رجسٹر نمبر موصول ہونے پر ان شاء اللہ تعالیٰ شائع ہو کر خریداران قاسم العلوم کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ امید کہ ناظرین کرام اس ہنگامی تغیر و تبدیل کو منجانب اللہ تصور فرما کر مطمئن رہیں گے اور سلطان العلوم کو قاسم العلوم کی جگہ قبول فرما کر عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں گے۔ آئندہ مراسلت دفتر سلطان العلوم دیوبند یوپی کا پتہ تحریر فرمائیں۔ خاکسار عتیق احمد صدیقی مہتمم قاسم العلوم دیوبند یوپی۔

مطبوعات

انگریزی ترجمہ صحیح البخاری مشرح از جناب محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ وائس)

انگریزی زبان میں قرآن مجید کے تو بہت سے ترجمے ہو چکے ہیں، اور اب بھی ہو رہے ہیں لیکن حدیث کی کسی مستند کتاب کا آج تک ترجمہ نہیں ہوا، اور یہ ایک بہت بڑی کمی تھی جس کی وجہ سے انگریزی خواں لوگوں کے لیے اسلام سے پوری طرح واقف ہونا مشکل تھا۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑا ہمارے ایک جرمن نو مسلم بھائی نے اٹھایا ہے، اور حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتاب "بخاری" کو انگریزی میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ فاضل مترجم کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ موجودہ دور میں جتنے یورپین حضرات نے اسلام قبول کیا ہے ان میں شائد بہت ہی کم آدمی ایسے ہوں گے جو دل و دماغ اور عملی زندگی کے لحاظ سے اس قدر مکمل مسلمان ہوئے ہوں۔ زیادہ تر یورپین نو مسلم ایسے پائے جاتے ہیں جو محض سطحی نظر سے اسلام کی بعض خوبیاں دیکھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں، مگر درحقیقت قبول اسلام سے ان کی ذہنیت اور ان کی زندگی میں کوئی خاص انقلاب نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثر تو اسلام کے ابتدائی معمولات تک کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ مغربی تہذیب کے تصورات، اور زمانہ جدید کی وضیع المشربی کے اصول نہایت گہری جڑوں کے ساتھ ان کے دل و دماغ میں جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن محمد اسد صاحب ان لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی کتاب (Islam on the Cross Road) دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نو مسلم تو درکنار، جو لوگ پشتینی مسلمان ہیں ان میں بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو اسلام کو اتنا صحیح سمجھتے ہوں اور جنہوں نے اسلام کی روح کو اتنی اچھی طرح جذب کیا ہو۔ یہ چیز محض فہم ہی کی حد تک نہیں ہے بلکہ انہوں نے حجاز میں رہ کر عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل بھی کی ہے اور اسلامی لٹریچر کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں۔

اس بنا پر وہ ہر طرح اس کے اہل ہیں کہ بخاری جیسی مشکل کتاب کا ترجمہ اور تحشیہ انگریزی زبان میں کر سکیں۔

ترجمہ کا صرف پہلا حصہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جو کتاب الایمان کے خاتمہ تک پہنچا ہے۔ ہر صفحہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوپر اصل عربی متن اور انگریزی ترجمہ ہے، او نیچے مختصر گر جامع حواشی درج کیے گئے ہیں۔ ہر باب کے آخر میں ایک ضمیمہ درج کیا گیا ہے جس میں ہر ایک حدیث کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ خود بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں کہاں کہاں آئی ہے۔ اس کے بعد پورے باب پر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ پورے باب کے مطالب اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہم نے ترجمہ اور حواشی کو پورے غور کے ساتھ لفظ بلفظ دیکھا۔ ہمارے نزدیک مترجم نے سمجھنے اور سمجھانے کا حق ادا کر دیا ہے، خصوصاً جہاں کہیں انہوں نے جدید ذہنیتوں کے مطابق احادیث کی مشکلات کو حل کیا ہے وہ تو انہی کا حصہ ہے۔

مترجم ہمارے ملک میں غریب الدیار ہیں، اور انہوں نے اتنی بڑی کتاب کی اشاعت کا بار اپنے اوپر لے کر بڑی ہمت کا اظہار کیا ہے اب یہ ہماری قوم کے انگریزی داں حضرات کا کام ہے کہ اس کتاب کو کثرت سے خریدیں تاکہ مترجم کا اصل مقصد بھی حاصل ہو اور ان کو کتاب کی اشاعت میں بھی مدد ملے۔ پوری کتاب، ۴ حصوں میں شائع ہوگی۔ ہر حصہ کی قیمت ہندوستان اور سیلون میں عہ ممالک غیر کے لیے چار شلنگ ملنے کا پتہ: عرفات پبلیکیشنز۔ سری نگر، کشمیر۔

Mohammad the Prophet — تالیف جناب فضل کریم خاں صاحب درانی ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار ٹرتھ، ریلوے روڈ، لاہور۔

یہ کتاب دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نہیں ہے، بلکہ سیرت پر ایک محققانہ تبصرہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صاحب فکر انسان تاریخ عالم کے پورے مرقع میں اسلام کے آخری اور سب سے بڑے داعی کی سیرت، اس کی شخصیت، اس کی تعلیم اور اس کے اثرات کا مطالعہ کر کے جن نتائج پر پہنچا ہے ان کو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ سیرت نبوی پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں،

جن میں مبسوط بھی ہیں، متوسط بھی اور مختصر بھی۔ حضور کی زندگی کے قریب قریب تمام چھوٹے اور بڑے واقعات روشنی میں آچکے ہیں لیکن فلسفۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ابھی تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ مسٹر درّانی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس تشنہ مضمون کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ یہ مضمون ایسا ہے جس پر بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے، اور اس میں تحقیق کے اتنے گوشے ہیں کہ ایک مختصر کتاب ان پر مشکل ہی سے حاوی ہو سکتی ہے، لیکن درّانی صاحب نے جو کچھ بھی لکھا ہے خوب لکھا ہے، اور ایسے موثر انداز بیان میں لکھا ہے جو مہذب دماغوں کو اپیل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض مقامات پر مصنف نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے جن سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہے مثلاً ان کا عرب جاہلیت کی برائیوں کو خفیف اور ان کی خوبیوں کو گراں قدر ثابت کرنا ہماری رائے میں کسی حد تک غیر متوازن ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے شرک اور انکار آخرت جیسی چیزوں کو تمدنی معائب کے مقابلہ میں خفیف تر قرار دے دیا ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہی دونوں تمام برائیوں کی جڑ ہیں، اور ان سے انسان کے صرف مذہبی اعتقادات ہی میں خرابی نہیں آتی بلکہ پوری انسانی تہذیب مجموعی حیثیت سے فاسد ہو کر رہ جاتی ہے۔ بلاشبہ مصنف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ عربی قوم میں بہت سی فطری خوبیاں ایسی تھیں جن کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے یہی قوم سب سے زیادہ موزوں تھی لیکن اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے اس قوم کی برائیوں کو ہلکا کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی خصوصیت کے ساتھ یہ چیز اس لئے کھٹکتی ہے کہ اس بحث میں مصنف کے خیالات متعدد مقامات پر اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیم قرآنی کے محکمات سے ٹکرا گئے ہیں۔

The Last Prophet

تالیف جناب فضل کریم خاں صاحب درّانی ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر اخبار ترجمہ، ریلوے روڈ، لاہور۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بہترین عقلی طریق استدلال سے ثابت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خدا کے آخری رسول ہیں ان کی تعلیم تمام نوع انسانی کے لیے اور ہمیشہ کے لیے کافی ہے، اور یہ ان کے بعد دنیا کو کسی نبی کی ضرورت نہیں۔

بحث کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ تقریباً تمام مذاہب کے بانیوں نے اپنے بعد کسی نہ کسی نبی یا اوتار یا بدھا کے آنے کی خبر دی ہے قریب قریب سب ہی نے اعتراف کیا (کسی نے صریح الفاظ میں اور کسی نے اپنی پیشین گوئی کے نتیجہ کے طور پر) کہ ابھی صداقت پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی، دین ابھی مکمل نہیں ہوا، دوسرے معلم یا معلموں کی ابھی ضرورت باقی ہے۔ بانیان مذاہب کے پورے گروہ میں صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسے ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ میں خدا کا آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، میرے ذریعہ سے دین مکمل ہوگیا اور صداقت پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ یہ دعویٰ قرآن کی صرف ایک آیت میں نہیں ہے۔ بکثرت آیات اس پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ پورے قرآن کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نازل کرنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے اس ارادہ کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ وہ اس کو انسان کے لیے آخری ہدایت نامہ بنانا چاہتا ہے۔ مزید براں قرآن کے مطالعہ سے یہ نقش بھی دل پر ثبت ہوجاتا ہے کہ محمد صلعم کا تصور کسی حد میں مقید نہیں، ساری کائنات پر پھیلتا ہے، ازل سے ابد تک پہنچتا ہے، اتھاہ ہے، لامحدود ہے۔ جو نبوت ایسے وسیع تصور اور ایسی غیر متناہی نظر کی حامل ہو عقل باور نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے مشن کو کسی محدود مکان یا زمان میں مقید رکھے گی۔

اس کے بعد مصنف نے ختم نبوت کا عقلی ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مذہب دائمی اور عالمگیر ہونے کا مدعی ہو اس کو ایسی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے جو قوانین طبعی کی طرح اٹل ہوں، جن کی صداقت کو ہر زمانہ میں جانچا جاسکتا ہو، جو خود اپنے اندر اپنی حقانیت کا ثبوت رکھتی ہوں۔ اس کا مدار ایسی چیزوں پر نہ ہونا چاہیے جو بجائے خود ثبوت کی محتاج ہوں یا جن کا غلط ہونا انسانی علم کی ترقی کے ساتھ کبھی نہ کبھی واضح ہوجائے، یا جنکی واقعیت زیادہ سے زیادہ ایک خاص زمانہ تک ثابت رہے اور آگے چلکر

مشتبہ ہو جائے۔ اس قاعدۂ کلیہ کو واضح کرنے کے بعد مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو پیش کر رہے ہیں اس کی صداقت کا مدار معجزات اور خوارق عادت پر نہیں ہے بلکہ ایسے حقائق پر ہے جن کے شواہد اور دلائل ہر زمانہ میں موجود ہیں، کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، ہر انسان خود اپنے نفس میں ان کو دیکھ سکتا ہے۔ قرآن بجائے خود اپنی صداقت کا ثبوت ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پورا تاریخی ریکارڈ ان کی صداقت پر گواہ ہے، اسلامی قانون کی ہمہ گیری، اس کی فطریت اور کاملیت آپ اپنی حقانیت پر شاہد ہے۔ لہٰذا جو مذہب ایسی بنیادوں پر قائم ہو وہ کسی زمانہ اور انسانی ترقی کے کسی درجہ میں بھی مضمحل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے زوال ہی نہیں ہے کہ اس کے بعد کسی اور دین کی ضرورت پیش آئے۔ اس میں باطل کو راہ ہی نہیں ملتی کہ اس کو مٹانے کے لیے حق کے دوبارہ آنے کی حاجت ہو۔

آخری سوال جو زمانۂ حال کے دماغوں میں سب سے زیادہ خلجان پیدا کرتا ہے یہ ہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ، ارتقا کے فطری قانون سے ٹکراتا تو نہیں؟ جدید زمانہ کا آدمی پوچھتا ہے کہ ایک خاص زمانہ کی ہدایت تمام زمانوں کے لیے کیونکر کافی ہو سکتی ہے؟ کیا ختم نبوت کے یہ معنی نہیں کہ انسان کے لیے ترقی کا دروازہ بند ہو گیا اور اب وہ اسی ساتویں صدی عیسوی کے دائرے میں مقید ہے؟ کیا انسان کے ذہنی نشو و ارتقا، اور امتداد زمانہ کے ساتھ بدلتے رہنے والے حالات کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ ہر دور میں اس کی ضروریات کے لیے نئی ہدایت آئے؟ مصنف نے اس سوال کو بڑی خوبی کے ساتھ حل کیا ہے اور نہایت محکم استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ ختم نبوت اور حقیقت ارتقا میں دراصل کوئی تعارض نہیں۔ ارتقا میں مانع ہونا تو درکنار، یہ چیز تو اس کے لیے الٹی معاون ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر سلسلۂ نبوت جاری رہتا تو انسان کے عقلی اور اخلاقی ارتقا میں مزاحم ہو جاتا۔

پوری کتاب باوجود مختصر ہونے کے نہایت اہم مباحث پر مشتمل ہے اور اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ مگر ایک بحث ایسی ہے جس سے ہم اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ مصنف نے جس باب میں معجزات

پر کلام کیا ہے وہاں ان کا مدعا ثابت کرنے کے لیے یہ بات بالکل کافی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عقلی اور فطری دلائل اور دائم الثبوت حقائق پر مبنی تھی، اور معجزات پر اس کا مدار نہیں رکھا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے خط مستقیم سے ہٹ کر بلا ضرورت یہ بحث چھیڑ دی کہ معجزات فی الواقع پیش ہی نہیں آئے، اور ان کی قطعیت تسلیم کرنا سرے سے غلط ہے، اور قرآن میں کہیں ان کا ذکر نہیں۔ اس سلسلہ میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ہم نے اس کو بہت غور سے دیکھا، ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ پر کافی تدبر نہیں کیا ورنہ اس قدر غلط فہمیاں پیش نہ آتیں۔ اگر کبھی موقع ملا تو ہم تفصیل کے ساتھ اپنے وہ دلائل بیان کریں گے جن کی بنا پر ہم ان کی رائے کو نادرست سمجھتے ہیں۔

Geographical History of the Holy Quran

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب ارض القرآن کا ترجمہ ہے جو مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی، پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ کے قلم سے نکلا ہے۔

ہمارے پیش نظر اس کی صرف پہلی جلد ہے۔ دو جلدیں ابھی باقی ہیں جو غالباً شائع نہیں ہوئیں۔ مترجم نے ارض القرآن کے محض ترجمہ پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ خود بھی تحقیقات کرکے اس پر کافی اضافہ کیا ہے۔ انگریزی زبان میں ایسی ایک کتاب کی سخت ضرورت تھی، کیونکہ قرآن کے تاریخی جغرافیہ پر اس زبان میں کوئی کتاب اب تک موجود نہ تھی، اور انگریزی پڑھنے والی دنیا کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ قرآن میں جن ملکوں اور قوموں کا ذکر ہے ان کی کوئی تاریخی اور جغرافی اصلیت نہیں۔

شائع شدہ جلد کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ: دی گریٹ ایسٹرن لائبریری۔ ۱۵ کالج اسکویر کلکتہ۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدنِ عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر۔ بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کے
عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس ۵۰ روپے تھی مگر سو ۱۰۰ روپے میں بھی نہیں ملتی تھی اب

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

کے جشن سیمین کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کیجانب سے شائع ہوچکی ہے
قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

سید عبدالقادر
پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و بیرو پرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ۱ چار مینار